معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۲۰/روپے فی شمارہ ۱۲/روپے

پاکستان میں سالانہ ۳۰۰/روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پچیس پونڈ یا چالیس ڈالر

بحری ڈاک نو پونڈ یا چودہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:

حافظ سجاد الٰہی ۲۷/اے، مال گودام روڈ، لوہار مارکیٹ، لاہور، پنجاب (پاکستان)

Mobile: 3004682752 ----- Phone: (009242) 7280916 5863609

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کی ۲۰ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع اسی ماہ کی آخری تاریخ تک دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہئے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

پرنٹر، پبلیشر، ایڈیٹر۔ ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

فہرست

مضمون نگاران معارف

۱۷۷ ویں جلد

ماہ جنوری ۲۰۰۶ء تا ماہ جون ۲۰۰۶ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست

مضامین معارف

۱۷۷ ویں جلد

ماہ جنوری ۲۰۰۶ء تا ماہ جون ۲۰۰۶ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

☆☆☆

جلد ۱۷۷ ماہ ذی الحجہ ۱۴۲۶ھ مطابق ماہ جنوری ۲۰۰۶ء عدد ۱

فہرست مضامین

email: shibli_academy @ rediffmail.com :ای میل

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

مختلف مذہبوں اور تہذیبوں کی طرح ہندوستان متعدد زبانوں کا بھی گہوارہ ہے، اکثر ریاستوں کی الگ الگ علاقائی زبانیں ہیں جو دوسری ریاستوں میں نہیں بولی اور سمجھی جاتیں، یہاں تک کہ ملک کی سرکاری زبان ہندی کو کئی جگہوں کے عوام نہیں بولتے اور سمجھتے، اردو ایک ملک گیر زبان تھی مگر ریاستوں کی نئی تشکیل میں اس کا اپنا کوئی مستقل علاقہ نہیں رہنے دیا گیا اور اس کے خاص علاقے کئی کئی ریاستوں کا حصہ بنا دیے گئے، مگر اس کے باوجود بہار، اترپردیش، دہلی پنجاب، ہریانہ، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر، آندھرا پردیش، کرناٹک، مغربی بنگال اور چنئی میں بھی بعض بعض جگہ لوگوں کی مادری زبان اردو ہے جس کا چلن ان ریاستوں میں تقسیم سے پہلے ہندی سے زیادہ تھا مگر ہندی کے پورے ملک کی سرکاری زبان ہوجانے کے بعد ان ریاستوں میں جن کی مادری زبان ہندی نہیں تھی، ان کی علاقائی زبانوں کو برقرار اور سرکاری کاموں کے لیے ان کا استعمال باقی رہنے دیا گیا لیکن جہاں بڑی تعداد میں اردو جاننے والے موجود تھے، وہاں سے اردو کا رواج اور سرکاری کاموں کے لیے اس کا استعمال بالکل ختم کردیا گیا۔

آزادی کے چند برس بعد اردو کی یہ ناقدری دیکھ کر اترپردیش میں اردو والوں نے اردو کو علاقائی زبان قرار دینے کے لیے دستخطی مہم شروع کی جو ناکام رہی، وقتاً فوقتاً مرکزی حکومت نے اردو کے فروغ کے لیے گجرال۔جعفری اور سرور کمیٹیاں قائم کیں مگر ان کی رپورٹیں سرد خانوں ہی کی زینت رہیں، انجمن ترقی اردو ہند کی بہار شاخ کی مساعی سے کانگریسی وزیر اعلا جگن ناتھ مصرا نے بعض اضلاع میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنائے جانے کا اعلان کر کے بہار کے امکان روشن کیے، اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اترپردیش کے وزیر اعلا کو بھی اسی طرح کا اعلان کرنے کی ہمت ہوئی مگر اس کو ان کے ایک کابینی وزیر نے ہائی کورٹ میں چیلنج کردیا، پھر وزیر اعلا نرائن دت تیواری نے یہی اعلان اس وقت کیا جب ان کی حکومت عالم نزع میں تھی، ایسے وقت کا تو ایمان و توبہ بھی معتبر نہیں ہوتی، چنانچہ اس کے بعد اترپردیش میں کانگریس کو برسر اقتدار ہونا نصیب نہیں ہوا، پھر حکومتوں کی متواتر شکست و ریخت اور ادل بدل اور بابری مسجد کے انہدام کے

بعد کے بڑھتے ہوئے فرقہ وارانہ جنون نے اردو والوں کے ذہن سے یہ بات محو کردی کہ اترپردیش میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنائے جانے کا اعلان ہو چکا ہے۔

اترپردیش میں ایسی اتھل پتھل رہی کہ اترپردیش اردو اکادمی اور دوسرے اردو ادارے عملاً معطل ہوگئے اور بڑے تکلف و تردد اور سخت حیص بیص کے بعد موجودہ حکومت کے سربراہ اردو اکادمی وغیرہ کی نئی تشکیل کے لیے آمادہ ہوئے، تشکیل کے ڈیڑھ دو برس گزرنے کے بعد اردو اکادمی کے صدر نے ۱۶- برس قبل کے حکم نامے کے متعلق اعلان کیا ہے کہ ایک بار پھر حکومت اترپردیش نے مختلف محکموں کے پرنسپل سکریٹری، جملہ سربراہان محکمات، سربراہان دفاتر، جملہ ڈویژنل کمشنر، ضلع مجسٹریٹ، جملہ کارپوریشن کو تاکید کی ہے کہ اردو طبقہ کے مفادات کے پیش نظر مندرجہ ذیل مقاصد کے لیے بطور دوسری سرکاری زبان اردو کو سرکاری محکموں میں استعمال کیا جائے، اردو میں عرضیوں اور درخواستوں کی موصولی اور اردو میں ان کا جواب، اردو میں تحریر، دستاویزوں اور رجسٹرار آفس کے ذریعہ حاصل کیا جانا، اہم سرکاری قاعدوں، ضابطوں اور نوٹیفکیشن کا اردو میں شائع کیا جانا، اہم سرکاری اشتہارات کی اردو میں بھی اشاعت، گزٹ کے اردو ترجمے کی اشاعت اور اہم سائن بورڈوں کو اردو میں لگایا جانا وغیرہ، یہ حکم نامہ وی۔ کے متل چیف سکریٹری اترپردیش کے دستخط سے جاری کیا جا چکا ہے اور ہدایت کی گئی ہے کہ جاری کردہ مذکورہ احکام کی دیانت داری سے موثر تعمیل یقینی بنائی جائے، جن لوگوں کو حکم نامے کی نقلیں برائے کارروائی بھیجی جا چکی ہیں ان کے نام گنا کر صدر اکادمی نے محبان اردو سے گزارش کی ہے کہ اگر ان کے اضلاع میں اس حکم نامہ پر عمل کرنے سے کوئی افسر گریز کر رہا ہو تو اس کی اطلاع اترپردیش اردو اکادمی کو ضرور دی جائے تاکہ یہ بات افسران اعلا تک پہنچائی جائے۔

اس بیان کی جو مذمت اترپردیش اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کی ایک ہنگامی میٹنگ میں کی گئی ہے وہ نامناسب ہے لیکن آرگنائزیشن نے جو سوالات کیے ہیں اور وضاحتیں چاہی ہیں وہ بجا اور قابل توجہ معلوم ہوتی ہیں، مثلاً حکم نامہ پر عمل سے گریز کرنے والے افسر کے خلاف کیسے اور کیا کرسکتے ہیں اور آج تک کیا کیا گیا ہے، کیوں کہ حکم نامہ کانگریسی حکومت کی جاں کنی کے زمانے کا سولہ سال پرانا ہے، سکریٹریٹ کے محکمہ لسانیات کا پرنسپل سکریٹری اردو میں لکھی گئی درخواست کا جواب ہندی میں دیتا ہے تو اس کے ماتحت افسران اردو درخواست کا جواب کیوں کر

اردو میں دیں گے، جب اتر پردیش کے کسی بھی ضلع کے رجسٹرار آفس میں اردو مترجم نہیں ہے تو اردو دستاویز کون لے گا، کس محکمہ کا کون سا قاعدہ وضابطہ اور نوٹیفکیشن اہم ہے جو اردو میں شائع کیا جائے گا اور آج تک کیا اور کتنا شائع ہوا ہے، اسی طرح کے سوالات، اشتہارات اور سائن بورڈوں کے متعلق بھی ہیں، اس سے آرگنائزیشن کا منشا یہ ہوگا کہ اس وقت حکومت سے یہ پوچھنے کی ضرورت تھی کہ سولہ برس پرانے احکام کا نفاذ کیوں نہیں ہوا؟ ان پر عمل درآمد میں اگر واقعی دشواریاں ہیں تو ان کو دور کیوں نہیں کیا گیا اور اب انہیں کس طرح دور کیا جائے گا، دراصل اردو کے معاملے میں اتر پردیش کی حکومتوں کی نیتیں صاف نہیں ہیں، وہ انتخابات کے موقع پر اردو والوں کو بہلانے اور خوش کرنے کے لیے یہ احکام جاری کردیتی ہیں، اس کا مقصد ان کا نفاذ نہیں ہوتا، افسران ان کا منشا اور اردو والوں کی کم زوریوں کو سمجھتے ہیں، ورنہ اگر حکومتیں مخلص ہوتیں تو افسران کو سرتابی کی جرأت نہ ہوتی اور تمام دفاتر میں اردو مترجموں کا تقرر کیا جاچکا ہوتا۔

ہمارے خیال میں بیان دینے سے پہلے ان امور کے بارے میں گفت وشنید کرلینی ضروری تھی، اردو تنظیموں کو اردو کے مسائل کے سلسلے میں متحد ہوکر جدوجہد کرنی چاہیے یا اپنے اپنے حدود کار متعین کرلینا چاہیے اور ٹکراؤ سے بچنا چاہیے جس کا فائدہ حکومتیں اٹھالیتی ہیں، اس وقت اردو کی اکثر تنظیمیں بہت سست اور مضمحل ہوگئی ہیں، اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن نئی اور فعال تنظیم ہے لیکن اس کا دائرہ محدود ہے، وہ اردو کی قانونی لڑائی میں پیش پیش رہتا ہے، تاہم وہ اردو والوں کی امداد، تعاون اور حوصلہ افزائی کا مستحق ہے، اردو تنظیموں کا ہدف یہ ہو کہ اسکولوں کی سطح پر اردو کی تعلیم ہو اور اردو علاقوں میں وہ سہ لسانی فارمولے میں شامل ہو، جس کا انتظام ریاستی حکومتوں کی ذمہ داری ہے مگر وہ اس سے پہلو تہی کررہی ہیں۔

جو لوگ اردو کو اپنی مادری زبان اور تہذیب کہتے ہیں لیکن اپنا کام نہ ہونے کے ڈر سے اردو کو دی گئی مراعات سے فائدہ نہیں اٹھاتے، انہیں طے کرنا چاہیے کہ آئندہ اپنی درخواستیں اور دستاویزیں اردو ہی میں حکام کو دیں گے چاہے ان کے عمل درآمد میں تاخیر ہو اور نقصان اٹھانا پڑے، کچھ لینے کے لیے کچھ دینا اور قربانی کرنی پڑتی ہے مگر یہ بھی ضروری ہے کہ ہر جگہ اردو عوام کی مدد کے لیے اردو تنظیموں کے وکلا، سیاسی اور سماجی کارکن اور رضا کار بھی رہیں۔

مقالات

قرون وسطی کے مسلمانوں کے سائنسی کارنامے

از:- پروفیسر ڈاکٹر ایم - ایس خان☆

"یہ مضمون اصلاً ایک کتاب پر تبصرہ ہے لیکن مضمون نگار نے اس میں قرون وسطی کے مسلمانوں کے سائنسی کارناموں سے اہم معلومات تحریر کیے ہیں، اس لیے اسے مضمون ہی کی حیثیت سے شائع کیا جارہا ہے، البتہ اس میں اردو کی جن سائنسی کتابوں کا ذکر آیا ہے وہ زیادہ بلند پایہ نہیں ہیں اور بعض تو اسکول کے طلبا کے لیے لکھی گئی ہیں"۔ (ض)

موجودہ دور سائنس اور ٹکنالوجی کا دور ہے، درس وتدریس، تحقیق وتفتیش کے لیے یہ نیا اور اہم مضمون سائنس کی تاریخ ہاتھ آیا ہے، گزشتہ کئی سالوں سے یہ مضمون یورپ اور امریکہ میں ہر دل عزیز ہے، اس لیے تقریباً ہر بڑی یونی ورسٹی میں سائنس کی تاریخ کا ایک نیا شعبہ قائم ہوا ہے اور پروفیسرز مقرر کیے گئے ہیں، اس کے نتیجے میں سائنس کی تاریخ پر بہت سی کتابیں دنیا کی مختلف زبانوں میں شائع ہورہی ہیں، اس مضمون سے متعلق بہت اعلا معیار کے رسالے بھی شائع کیے جاتے ہیں۔

لیکن یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہے کہ سب سے پہلے ایک عرب مسلمان نے دنیا میں سائنس کی پہلی مکمل تاریخ لکھی تھی، اس کا نام ابوالقاسم قاضی صاعد الاندلسی ہے جن کا انتقال اندلس

☆ پارک اسٹریٹ، پوسٹ بکس نمبر 9448، کلکتہ 700016، مغربی بنگال۔

کے شہر طلیطلہ میں ۱۰۷۰ء میں ہوا تھا، کتاب کا نام "طبقات الامم" ہے جو چھپ چکی ہے۔(۱)

اب اردو میں بھی سائنس اور ٹکنالوجی کے متعلق کتابیں شائع کی جارہی ہیں، قرآن اور سائنس پر پروفیسر ایم۔اے۔عظیم نے ایک کتاب لکھی جو نئی دہلی سے ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئی ہے، مولانا عبدالباری ندوی کی کتاب "مذہب اور سائنس"، لکھنؤ سے ۱۹۷۶ء میں شائع ہو چکی ہے، مکتبہ الحسنات دہلی نے مولانا ابراہیم عمادی ندوی کی کتاب "مسلمان سائنس داں اور ان کی خدمات" ۱۹۸۵ء میں شائع کی ہے، اس کتاب کے مصنف نے لکھا ہے کہ یہ مسلم دور اول کے تقریباً سات سو سال کی روشن علمی کہانی تاریخ کی زبانی ہے لیکن اس میں بہ کثرت غلطیاں ہیں، جناب حبیب احمد صدیقی کی کتاب مسلمان اور سائنس کی تحقیق ۱۹۸۸ء میں کراچی سے چھپی ہے جو معلومات سے پُر ہے لیکن اس میں حواشی اور حوالہ جات نہیں ہیں، ان کے علاوہ ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی کتاب یورپ پر اسلام کے احسانات ۱۹۶۴ء میں لاہور سے چھپی ہے جس میں قرون وسطیٰ میں مسلمان سائنس دانوں کی تاریخ موجود ہے، اس میں بھی غلطیاں ہیں لیکن کم، اس موضوع پر ایک اور اہم کتاب کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، یہ شہرۂ آفاق سائنس کے مورخ فواد سیزگین کی عربی کتاب محاضرات فی تاریخ العلوم العربیۃ والاسلامیۃ ہے جو جرمنی سے شائع ہوئی ہے، اس کا اردو ترجمہ تاریخ علوم میں تہذیب اسلامی کا مقام ڈاکٹر خورشید رضوی نے ۱۹۹۴ء میں ادارۂ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد سے شائع کیا ہے، یہ ایک بہت اعلا معیار کی کتاب ہے جو نہ صرف معلومات افزا ہے بلکہ بصیرت افروز بھی ہے، راقم کو معلوم ہوا ہے کہ UNESCO پریس سے ایک کتاب "سائنس کی ترقی میں مسلمانوں کا حصہ" شائع ہوئی ہے لیکن راقم کی نظر سے اب تک نہیں گزری ہے۔

اس مضمون میں مجھے ڈاکٹر غلام قادر لون کی کتاب پر اظہار خیال مقصود ہے جو مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز نئی دہلی سے ستمبر ۱۹۹۹ء میں شائع ہوئی ہے اور ۳۵۳ صفحات پر مشتمل ہے، اس

(۱) معارف: غالباً فاضل مقالہ نگار کو اس کا علم نہیں ہو سکا کہ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی نے اس کا اردو ترجمہ کیا تھا جس کو دارالمصنفین نے پہلی بار ۱۹۲۸ء میں معارف پریس، اعظم گڈھ سے شائع کیا تھا جو عرصے سے ناپید تھی، اس لیے اب دوبارہ ۲۰۰۵ء میں اس کا نیا ایڈیشن نکلا ہے۔

کتاب سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ مصنف کے خیال میں لفظ سائنس کے معنی کیا ہیں جس کی تاریخ اس کتاب میں لکھی گئی ہے، یہ ضروری تھا کہ کتاب کی ابتدا ہی میں سائنس کی تشریح کردی جاتی۔

اس میں پہلے پیش لفظ ہے اور اس کے بعد مقدمہ، ایک باب بہ عنوان "علم کا مقام" ہے جو بہت ہی سرسری اور مختصر ہے، پہلا باب بہت ہی بصیرت افروز اور جامع ہوتا تو بہتر تھا، اس کی تفصیل لکھنا یہاں ممکن نہیں ہے لیکن ایک باب قرآن اور سائنس پر بھی ہونا چاہیے تھا اور ایک باب میں یہ واضح کرنا ضروری تھا کہ ابتدائی دور میں سائنس کے متعلق، مسلمانوں نے معلومات کہاں سے حاصل کیے، اسی جامع اور معلومات افزا باب میں یہ واضح کیا جاتا کہ مسلمانوں نے سائنس کی کچھ بنیادی معلومات یونان، ایران اور ہندوستان سے حاصل کیے تھے اور ان ملکوں میں لکھی گئیں سائنس کی بہت سی کتابوں کا ترجمہ عربی میں کیا گیا تھا جن میں سے اکثر آج بھی موجود ہیں لیکن ان میں یونانی کتابیں سب سے زیادہ اور اہم تھیں جن سے مسلمانوں نے استفادہ کیا، ان کی بہت مختصر تاریخ قلم بند کرنا بہت ہی مناسب بلکہ ضروری تھا۔

اس کو "گیارہ" باب میں تقسیم کیا گیا ہے یعنی تاریخ نگاری، جغرافیہ، معدنیات، نباتات، حیوانات، علم الکیمیا، طبیعیات، فلکیات، ریاضیات، طب اور فلسفہ، یہ "گیارہ" باب مسلمانوں کے سائنسی کارناموں کا پوری طرح احاطہ نہیں کرتے، یہ کہا جاسکتا ہے کہ تاریخ نگاری پر ایک باب شامل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی، بہتر ہوتا اگر فلکیات کی جگہ پر علم الہیئۃ پر ایک باب ہوتا اور ریاضیات کی جگہ علم الہندسہ، علم الحساب اور علم الجبر والمقابلہ پر علاحدہ علاحدہ باب ہوتے، اسی طرح ایک ایک باب علم طبقات الارض (GEOLOGY) اور آثار علویہ (METEOROLOGY) پر بھی ہونا چاہیے تھا۔

ماٰخذ ہر باب کے آخر میں اس سے متعلق حواشی و حوالہ جات دیے گئے ہیں جن میں اس کے ماٰخذ کی کتابوں اور رسالوں کے نام درج ہیں، ان ماٰخذ پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف کو اس کا علم نہیں ہے کہ ماٰخذ دو طرح کے ہوتے ہیں: بنیادی (PRIMERY) اور ثانوی (SECONDARY)، انہوں نے دونوں ماٰخذ کو خلط ملط کردیا ہے، جیسا کہ صاف نظر آتا ہے، ان کے ماٰخذ زیادہ تر انگریزی کی ثانوی کتابیں ہیں جن میں بعض متروک اور فرسودہ ہیں مثلاً JOHN WILLIAN DRAPER

A HISTORY OF THE INTELLECTUAL DEVELOPMENT OF EUROPE کی اور ROBERT BRIFFAULT کی THE MAKING OF HUMANITY موخر الذکر کا اردو ترجمہ تشکیل انسانیت کے حوالے اس کتاب میں بہت زیادہ ہیں، اس کتاب کے لکھنے میں ENCYCLOPEDIA BRITANNICA پر مصنف نے بہت بھروسہ کیا ہے لیکن ENCYCLOPEDIA OF ISLAM سے بہت کم استفادہ کیا ہے ENCYCLOPEDIA سے جو معلومات حاصل کیے جاتے ہیں وہ ہمیشہ صحیح اور معتبر نہیں ہوتے ہیں اور جب راقم آکسفورڈ یونی ورسٹی کا طالب علم تھا تو اس کے بہت ہی محترم و معظم استاد پروفیسر ایچ، اے، آر، گب صاحب نے اسے ہدایت دی تھی کہ وہ اپنے کسی مقالے میں ENCYCLOPEDIA OF ISLAM کے علاوہ کسی اور دوسرے ENCYCLOPEDIA کا حوالہ نہ دے۔

ان کے علاوہ ان کے ماخذ زیادہ تر اردو کی ثانوی کتابیں ہیں، ان میں سے ایک ''معروف مسلم سائنس داں'' ہے جو لاہور سے چھپی ہے، اس کا وہ حوالہ بار بار دیتے ہیں لیکن یہ کتاب راقم کی نظر سے نہیں گزری، یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ مصنف نے عربی کی بے شمار ابتدائی اور ثانوی کتابوں سے استفادہ کیوں نہیں کیا، بعض عربی کتابوں کے حوالے بھی اس میں ملتے ہیں لیکن بہت کم، مسلمانوں نے سائنس کی ترقی و ترویج میں جو خدمات انجام دی ہیں، ان پر گزشتہ تیس برسوں میں بہت سی ثانوی لیکن معیاری کتابیں عربی، انگریزی اور دوسری زبانوں میں شائع ہوئی ہیں، یہ ظاہر ہے کہ مصنف کو ان کتابوں کا علم نہیں ہے، اس مضمون میں ان کتابوں کا نام لکھنا ممکن نہیں لیکن یہ واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مصنف یہ نہیں جانتے کہ عربی میں دو اہم اور بنیادی کتابیں موجود ہیں اور ان سے اس کتاب کے لکھنے میں بڑی مدد مل سکتی تھی، یعنی القفطی کی ''تاریخ الحکماء'' اور ابن ابی اصیبعہ کی ''عیون الانباء فی طبقات الاطباء'' لہذا ان دو کتابوں سے استفادہ نہ کر کے قرون وسطی کے مسلمانوں کی سائنسی خدمات کا جائزہ صحیح اور مکمل نہیں ہوسکتا، ان کے علاوہ اور دو بہت اعلا معیار کی اہم کتابیں شاید مصنف کو دستیاب نہیں ہیں، یعنی CARL BROCKELMAN کی کتاب (۱) جو پانچ جلدوں میں ہے اور مشہور ترک مصنف

(۱) GESCHICHTE DER ARABISCEN LITTERATURE (E.J. BRILL, LEIDEN)

FUAT SEZGIN کی کتاب (۱) جس کی بارہ جلدیں چھپ چکی ہیں، یہ دونوں کتابیں جرمن زبان میں ہیں، عربی کتابوں میں مصنف جرجی زیدان کی ''تمدن عرب'' کا بار بار حوالہ دیتے ہیں لیکن یہ کتاب معتبر نہیں ہے، ان کی کتاب تاریخ التمدن الاسلامی پر تنقید کرتے ہوئے مولانا شبلی نعمانی نے ایک کتاب ''الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی'' عربی میں لکھی ہے جو آسی پریس لکھنؤ سے ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی تھی (۲)۔

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مصنف نے چند اعلا معیار کی تحقیقی اور معلومات افزا کتابوں سے بھی صحیح طور پر استفادہ کیا ہے لیکن عرب، ایرانی اور ترک مصنفین کی کتابوں کو نظر انداز کر کے اور ان سے استفادہ نہ کر کے انہوں نے اس کتاب کی اہمیت کو بہت کم کر دیا ہے اور وہ اس کا توازن برقرار نہ رکھ سکے۔

ان ماخذ میں ایک خامی یہ بھی ہے کہ مصنف اکثر اصل کتاب کا حوالہ نہیں دیتے بلکہ عام طور سے اردو ترجموں کا ذکر کرتے ہیں، جو شخص بھی اس کتاب کا مطالعہ کرے گا وہ اس خامی کو اچھی طرح سمجھ جائے گا، یہاں چند مثالیں دینا کافی ہوگا، لطفی جمعہ کی مشہور کتاب ''تاریخ فلاسفۃ الاسلام'' کے اصل متن کا حوالہ نہ دے کر اس کے اردو ترجمے کا حوالہ دیا گیا ہے، اسی طرح بہت سی انگریزی کتابوں کے اردو ترجمے کا حوالہ وہ دیتے ہیں لیکن اصل کتاب کا حوالہ نہیں دیتے، عربی کتابوں کے اصل متن کا اکثر حوالہ انہوں نے نہیں دیا ہے لیکن ان کے اردو ترجمے کا ذکر کیا ہے، غزالی کی مشہور کتاب ''تہافتہ الفلاسفۃ'' کے اصل متن کا وہ ذکر نہیں کرتے، وہ ڈاکٹر میر ولی الدین کے اردو ترجمے کا حوالہ دیتے ہیں، اولیری کی انگریزی کتاب کے اردو ترجمے کا وہ ذکر کرتے ہیں لیکن یہ کتاب بالکل معتبر نہیں سمجھی جاتی ہے۔

تاہم اس کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ مصنف کو اس کتاب کے موضوع سے خاص دل چسپی ہے اور انہوں نے بڑی محنت اور جاں فشانی سے یہ کتاب لکھی ہے، میرا خیال ہے کہ قرون وسطی میں سائنس کی جو خدمات مسلمانوں نے کی ہے ان کا ایک مختصر جائزہ اس کتاب میں موجود ہے،

(۱) GESCHICH TE DES ARABI SCHE SCHRIFTTUNS (E. J. BRILL, LEIDEN)

(۲) معارف: فاضل مقالہ نگار کو غالباً پتا نہیں کہ اس کا نیا ایڈیشن معارف پریس اعظم گڈھ سے ۱۹۹۸ء میں نکلا ہے

مجھے اس کا علم نہیں ہے کہ اس موضوع پر اس معیار کی کوئی اور کتاب اردو میں ہندوستان میں شائع ہوئی ہے، اردو میں جو کتابیں چھپی ہیں اور جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ان میں یہ کتاب پر از معلومات ہے، میں یہ دعوانہیں کرتا کہ اردو کی جتنی کتابیں اس موضوع پر چھپی ہیں، وہ سب راقم کی نظر میں ہیں، اس کے تین باب خاص طور سے فلکیات، ریاضیات اور طب اچھے اور معلومات افزا ہیں، اس کی ایک خوبی یہ ہے کہ یورپ اور امریکہ کی سائنس کے مورخوں کی رائیں ان موضوعات پر نقل کی گئی ہیں، خاص کر وہ رائیں جو مسلمانوں کی تعریف میں ہیں اور جو رائیں مسلمانوں کی مخالفت میں ہیں ان پر تنقید کر کے ان کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے اور حوالہ کے ساتھ ان کو غلط ثابت کیا گیا ہے، اس کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام نے انسان کی تہذیب پر جو احسان کیا ہے وہ بہت اہم ہے اور ان کا اعتراف ضروری ہے، مسلمانوں کی خدمات کی اہمیت اس لیے اور بڑھ جاتی ہے کہ انہوں نے علوم وفنون کو اس وقت بہت ترقی دی جب یورپ تاریک دور سے گزر رہا تھا، یہ صحیح ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے سے ان خدمات واحسانات کی حقیقت و اہمیت کچھ کچھ واضح ہو جاتی ہے، یہ کہا جاسکتا ہے کہ مصنف نے حواشی وحوالہ جات کی ضرورت اور اہمیت کو سمجھا ہے، اس لیے ہر باب کے آخر میں ان کو شامل کر دیا ہے، یہ کتاب قرون وسطی کی تاریخ سے تعلق رکھتی ہے، زمانہ حاضر سے نہیں، اگرچہ قرون وسطی کی تاریخی حد بندی میں اختلاف رائے موجود ہے لیکن ان میں سائنس سے جو علوم وفنون سمجھے جاتے تھے مجموعی طور پر ان کی تاریخ اس کتاب میں موجود ہے لیکن بالکل جدید دور کی سائنس سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس کتاب کے مآخذ کی عمومی خامیوں کو اوپر واضح کیا جاچکا ہے اب ذیل میں مختصر طور پر اس کی انفرادی خامیوں کی نشان دہی کی کوشش کی گئی ہے، اس کے بعد واقعات کی غلطیوں کو بھی اجاگر کیا گیا ہے نیز اس میں کسی بیان میں اگر کوئی کمی رہ گئی ہے یا خلا ہے تو اس کو بھی پر کرنے کی کوشش کی گئی ہے، مزید جدید تحقیقات کی روشنی میں واقعات و بیانات کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس کی بنا پر اگر غلطیاں نظر آئی ہیں تو ان کی تصحیح کر دی گئی ہے، واقعات کی غلط تاریخ یا غلط اعداد وشمار کو واضح کر دیا گیا ہے اور موجودہ تحقیق وتفتیش کی روشنی میں ان کو بھی درست کر دیا گیا ہے لیکن اگر ان تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر اس پوری کتاب کا جائزہ لیا جاتا تو مضمون بڑا طویل ہو جاتا، اس لیے

طوالت سے بچنے کے لیے راقم نے اپنی بحث وگفتگو کو صرف ۱۲۲ صفحے تک محدود رکھا ہے۔

صفحہ ۶، سطر ۱۶: الغ بیگ سائنس داں کے بارے میں یہ لکھنا کہ وہ انیسویں صدی کے تھے بالکل غلط ہے، دراصل ان کی وفات ۱۴۴۹ء / ۸۵۳ھ میں ہوئی تھی۔

ص ۱۰، س آخری: الکلمة الحکمة صحیح نہیں ہے صرف الحکمة صحیح ہے۔

ص ۱۱، س ۹-۷: یہ جملہ کہ ”محترم جاوید اقبال صاحب کی خواہش تھی کہ مسلم سائنس دانوں کی خدمات کے اعتراف میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا اور دو ایک فضلائے یورپ کی شہادتوں پر انحصار کیا جائے“، صحیح مشورہ نہیں ہے اور شاید اسی کی وجہ سے اس کتاب کے مآخذ اتنے ناقص ہیں۔

ص ۱۵، س ۸/۷: تبصرہ غلط اور بے بنیاد ہے، حضور سرور کائنات حضرت محمد ﷺ کا جنگ میں ہارے ہوئے قیدیوں کو تعلیم دینے کی ذمہ داری سونپنا بہت مناسب قدم تھا۔

ص ۱۸، س ۱۹: مصنف کو یہ معلوم نہیں ہے کہ ابن اسحاق کی سیرت النبی کا اصل مخطوطہ مل گیا ہے اور اسے مشہور عالم ڈاکٹر حمید اللہؒ نے اپنے حواشی کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔

ص ۱۹، س ۱۲: ”اگر صرف مورخ اور ان کی تصنیف کے نام پر اکتفا کیا جائے تب بھی کئی جلدیں درکار ہوں گی“ مبالغہ ہے، دراصل ایک ضخیم جلد میں کل عرب مورخین اور ان کی تاریخ یا تاریخوں کے نام آسانی سے شائع کیے جاسکتے ہیں، دیکھیے TRANZ ROSENTHAL کی بہت جامع اور معلومات افزا کتاب A HISTORY OF MUSLIM HISTORIOGRAPHY کا دوسرا ایڈیشن (لائیڈن، ۱۹۸۶ء) جس میں سب عرب مورخین کا ذکر شامل ہے۔

ص ۲۱، ۲۲، ۲۳: ابن خلدون کے تحت یہ لکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مشہور فرانز روزنتھال نے اس کے مقدمے کا بہت عمدہ انگریزی ترجمہ تین جلدوں میں چھاپ دیا ہے، چیمبرس انسائیکلوپیڈیا کی جگہ مصنف کو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا حوالہ دینا ضروری تھا جس میں ابن خلدون پر ایک عمدہ مقالہ موجود ہے، دیکھیے جلد ۳ (۱۹۷۱) ایم طالبی کا مضمون ابن خلدون، صفحات ۸۲۵۔

ص ۲۶: ARNOLD TOYNBEE کی جو رائے ابن خلدون کے بارے میں نقل

کی گئی ہے اس کا حوالہ اردو دائرۃ المعارف الاسلامیۃ سے دیا گیا ہے، ان کی مشہور کتاب جو دس جلدوں میں ہے HISTORY OF THE WORLD کا حوالہ دینا مناسب تھا۔

ص ۲۷: یہ لکھنا چاہیے کہ مسلمانوں نے بطلیموس (PTOLEMY) کی عظیم کتاب AL-MAJEST کا ترجمہ المجسطی عربی میں کیا تھا، آثار العلویۃ او السماء والعالم ارسطو کی کتابیں ہیں، افلاطون کی نہیں، جیسا کہ یہاں لکھا گیا ہے، ارسطو کی کتاب مابعد الطبیعات کا عربی میں ترجمہ ضرور ہوا تھا لیکن یہ کتاب METAPHYSICS پر ہے، اس کا علم جغرافیہ سے کوئی تعلق نہیں۔

ص ۲۹: یہ واضح کرنا چاہیے تھا کہ ابن حوقل اور دوسرے عرب مسلمانوں نے جغرافیہ عالم لکھا اور دنیا کی تاریخ میں پہلی دفعہ کثرت سے نقشے (MAP) ان کتابوں میں شامل کیے، موجودہ زمانے میں دنیا کے اسکولوں میں جغرافیہ کے کلاسوں میں یہ نقشے کثرت سے استعمال کیے جاتے ہیں اور ضروری سمجھے جاتے ہیں۔

ص ۲۹: ویل دوران کا ایک جملہ مصنف نے نقل کیا ہے کہ المقدسی نے اسپین کے تمام اسلامی علاقوں کا سفر کیا ہے، بے شمار نشیب و فراز دیکھے اور ۹۸۵ میں احسن التقاسیم تصنیف کی جو البیرونی کی تاریخ الہند سے پہلے عرب جغرافیہ کی عظیم ترین کتاب رہی ہے، یہ صحیح نہیں ہے کیوں کہ البیرونی کی کتاب کا موضوع ہندوستان کا جغرافیہ نہیں ہے، کتاب الہند گیارہویں صدی عیسوی میں ہندوستان کی معاشرت، تہذیب و تمدن اور مذاہب، فلسفہ و ادب پر ایک بہت ہی اہم اور سائنٹفک کتاب ہے، اس معیار کی کتاب آج تک ہندوستان کی تاریخ میں کسی زبان میں بھی لکھی نہیں جاسکی ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ اس میں ایک اہم باب ہندوستان کے جغرافیہ پر بھی شامل ہے، یہ ایک بہت بڑے مسلمان مورخ / سائنس داں کا کارنامہ ہے۔

ص ۳۳: یاقوت الحموی کی کتاب معجم البلدان کے بارے میں یہ لکھنا تھا کہ یہ دنیا کی سب سے پہلی کتاب ہے جسے ایک مسلمان نے جغرافیائی معلومات پر حروف تہجی کے مطابق چار جلدوں میں مرتب کی تھی، اس کی تقلید کرتے ہوئے آج ساری دنیا میں سیکڑوں GEOGRAPHICAL DICTIOARY شائع کی جارہی ہیں لیکن اس فن میں ایک مسلمان کو شرف اولیت حاصل ہے، یاقوت الحموی نے ایک اہم کارنامہ یہ بھی انجام دیا کہ اس نے معجم الادبا یعنی علما و ادبا کے حالات

زندگی اور علمی افادات پر حروف تہجی کی ترتیب سے ایک ضخیم کتاب لکھی جو OXFORD UNI'ERSITY سے سات جلدوں میں شائع ہوئی اس کا انگریزی نام A DICTIONARY OF LEARNED MEN رکھا گیا ہے، اس کی تقلید میں مغربی ممالک میں خاص طور سے موجودہ زمانے میں NATIONAL BIOGRAPHICAL DICTIONARY شائع کی جارہی ہیں، مسلمانوں نے علم جغرافیہ پر جو کتابیں لکھی ہیں یا جن ملکوں کے بارے میں لکھا ہے ان کی ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ ہر ملک کے صوبوں یہاں تک کہ گاؤں کے معاشرتی، تہذیبی، لسانی اور مذہبی حالات کے بارے میں بھی معلومات فراہم کیے جو موجودہ زمانے میں HUMAN GEOGRAPHY یا CULTURAL GEOGRAPHY کی کتابوں میں ملتے ہیں، ان کتابوں میں مسلمانوں نے علم الہیئۃ کے بارے میں بھی معلومات فراہم کیے ہیں، ان کے سفرناموں میں بھی کافی سائنسی معلومات ملتے ہیں، ایک حدیث میں مسلمانوں کو حصول علم کے لیے دور دراز ملکوں کا یعنی چین تک سفر کرنے کی ہدایت دی گئی ہے۔

ص ۴۲، ۴۳: ADELARD OF BATH کے بارے میں یہ لکھنا مناسب تھا کہ ان کی تاریخ وفات معلوم نہیں ہے لیکن وہ ۵۲۰ھ مطابق ۱۱۲۶ء عیسوی میں زندہ تھے، یہ اس لیے مناسب ہے کیوں کہ قرون وسطی کے دوسرے عیسائی عالموں کے سن وفات لکھے گئے ہیں۔

مسلمانوں نے دنیا کے موسمی حالات اور کرۃ الارض کے بارے میں معلومات فراہم کرنے میں بڑی محنت اور جاں فشانی سے کام لیا ہے، انہوں نے دور دراز ملکوں کا سفر کیا اور جو کچھ لکھا اپنے ذاتی مشاہدہ کی بنا پر لکھا، اس سلسلے میں انہوں نے دوسرے علما اور سائنس دانوں کی غلطیوں کو بھی واضح کردیا ہے، مثلاً PTOLEMY نے اپنی کتاب GEOGRAPHY میں ایک جگہ لکھا ہے کہ جنوبی افریقہ اور جنوبی ہندوستان ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں، یعنی INDIAN OCEAN بحر ہند ایک خطۂ آب ہے جو چاروں طرف سے بند ہے لیکن عرب ملاحوں اور تاجروں نے اپنے ذاتی مشاہدہ کی بنا پر اس بیان کو غلط ثابت کردیا، انہوں نے اپنی جان کو جوکھم میں ڈال کر بار بار بحر ہند میں جہاز رانی کی اور جب ذاتی مشاہدہ سے انہیں یقین ہوگیا کہ بطلیموس کا بیان صحیح نہیں ہے تو انہوں نے اس کے بیان کو غلط ثابت کردیا، یہ ممکن اس لیے بھی ہوا

کہ وہ بحر ہند کے جنوب سے گزر کر بحر چین تک ملاحی اور تجارت کرتے تھے، یہ سچ ہے کہ وہ ایک
تجربہ کار عرب جہاز راں ابن ماجد تھا جس نے واسکوڈی گاما کو ۱۴۹۸ء میں ہندوستان کے ساحل
تک پہنچادیا۔

علم الارض اور معدنیات کا باب، بہت مختصر ہے، اس میں البیرونی کی کتاب الجماهر
فی معرفة الجواهر پر کچھ تفصیل سے لکھنا چاہیے تھا، اس کتاب کی اہمیت کے پیش نظر حکیم محمد سعید
شہید (مرحوم) نے اس کا انگریزی ترجمہ کراچی سے بالاقساط اپنے موقر رسالہ HAMDARD ISLAMICUS
میں شائع کرنا شروع کیا تھا، اب یہ ترجمہ مکمل طور پر کتابی صورت میں کراچی سے شائع ہوگیا ہے،
اس کا متن بھی ایک جرمن محقق KRENKOW نے حیدرآباد سے شائع کیا تھا۔

ص ۵۹، س ۱۵: ابن الندیم کی کتاب الفہرست میں معدنیات سے متعلق کتابوں
کے نام کا ذکر کیا گیا ہے لیکن اس کی مشہور کتاب کا نام نہیں لکھا گیا ہے اور یہ بھی نہیں لکھا گیا ہے
کہ اس کتاب کے آخر میں دسویں باب میں معدنیات پر کتابوں کا ذکر ہے، اس کے علاوہ مصنف
نے ان کی تاریخ وفات ۴۴۸ھ مطابق ۱۰۴۷ء لکھی ہے جو بالکل غلط ہے، ابن الندیم نے اپنی
کتاب ۳۸۰ھ مطابق ۹۹۱ء میں مکمل کی تھی، اس کتاب کا انگریزی ترجمہ امریکن عالم
BAYARD DODGE نے دو جلدوں میں ۱۹۷۰ میں کولمبیا یونی ورسٹی نیویارک سے THE
FIHRIST OF A-NADIM شائع کیا تھا، اس کے مقدمے میں XXII پر اس کی وفات کی
تاریخ 380/991 لکھی گئی ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے، یاد رہے کہ یہ دنیا کی سب سے پہلی
BIBLIOGRAPHY ہے جسے ایک مسلمان وراق یعنی تاجر کتب نے مرتب کی تھی، اس طرح
کی BIBLIOGRAPHY ہر ملک میں اکثر شائع ہوتی رہتی ہیں، اس علم کو بھی دنیا نے مسلمانوں
سے سیکھا ہے لیکن اس کا اعتراف نہیں کیا جاتا کیوں کہ بہت کم عالموں کو معلوم ہے کہ اس علم کا
موجد ایک مسلمان ہے، البیرونی کی مذکورہ کتاب الجماهر پر تفصیل سے لکھنا چاہیے تھا، اس کے علاوہ
اس نے کتاب الہند میں اس حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ ہندوستان اس کی موجودہ شکل میں کیسے
اس دنیا میں ظہور پذیر ہوا، جو بہت اعلا اور علم الارض کے نقطۂ نگاہ سے صحیح ہے، وہ لکھتا ہے کہ اگر
کوئی جنوبی ہند کے ساحل پر زمین کو غور سے دیکھے تو اسے معلوم ہوگا کہ پہاڑوں کے نزدیک پتھر

بڑے بڑے ہیں اور بحر ہند کے نزدیک ساحلوں پر یہ پتھر بہت چھوٹے چھوٹے ہیں اور وہ سفوف
ہوکر ریت کی شکل اختیار کررہے ہیں، اس سے ہر بیدار مغز شخص یہ آسانی سمجھ سکتا ہے کہ ہندوستان
زمانہ قدیم میں ایک بہت بڑا سمندر تھا اور یہ رفتہ رفتہ پتھروں کی مٹی اور تودہ ریت جو سیلاب کی
وجہ سے آکر جمع ہوگئی تھیں، زمین کی شکل اختیار کرگئی ہے (دیکھیے کتاب الہند، البیرونی تصحیح کردہ
متن، EDWARD C. SACAU, BERLIN, 1887) ص ۱۹۷ اور اس کا انگریزی ترجمہ
بھی زاخاؤہی نے INDICA کے نام سے ۱۸۸۸ میں شائع کیا (جلد اول، ص ۱۹۸)، اس باب
کی اہمیت کے پیش نظر اگرے بوں اور سدیو کی کتابوں سے مصنف استفادہ نہ کرتے تو اچھا تھا،
اوپر اشارہ کیا گیا ہے کہ علم الارض یا GEOLOGY پر اس کتاب میں کوئی باب نہیں ہے جو اس
کتاب کی ایک خامی کہی جاسکتی ہے، یہاں یہ لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ معدنیات کے
باب میں اس کتاب میں علم الارض کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کیے گئے ہیں جو کافی نہیں
ہیں۔ (دیکھیے ص ۶۲ و مابعد)

ص ۷۲-۸۷: مسلمانوں نے علم النباتات میں جو خاص دل چسپی لی اس کے دو اہم
اسباب ہیں، وہ علم زراعت یعنی AGRONOMY میں خاص دل چسپی اس وجہ سے رکھتے تھے کہ
وہ کاشت کاری کو ترقی دیں تاکہ غلہ کی پیداوار زیادہ سے زیادہ اور بہتر ہو اور وہ اس میں خود کفیل
ہوجائیں اور اگر ممکن ہو تو دوسرے ملکوں میں غلہ برآمد کرسکیں، جیسا کہ اندلس کے مسلمانوں نے
کیا تھا، دوسرا سبب یہ تھا کہ یونانی اسلامی طب میں علاج کے لیے بہت سی جڑی بوٹیوں کا
استعمال ہوتا تھا۔

ص ۷۳، س ۲۰: اس علم پر البیرونی کی کتاب الصيدله فی الطب لکھا ہے،
جدید تحقیق کے مطابق اس کتاب کا صحیح نام "کتاب الصيدله فی الطب" تسلیم کرلیا گیا
ہے، اس کتاب کا عربی متن اور انگریزی ترجمہ حواشی و تعلیقات کے ساتھ شہید حکیم محمد سعید نے
مرتب کرکے تین جلدوں میں کراچی سے ۱۹۷۳ء میں شائع کردیا تھا، اس علمی کام میں پروفیسر
رانا احسان الٰہی (لاہور) ان کے معاون تھے اور ڈاکٹر سامی کے حرنہ نے اس کی تفسیر اور مفید
حواشی لکھے تھے، البیرونی نے یہ کتاب ذاتی مشاہدہ کی بنا پر لکھی تھی، انہوں نے یونانی عالموں کے

ہر بیان کو تحقیق کر کے دیکھا تھا کہ وہ صحیح ہے یا نہیں، اگر صحیح ہوتا تو وہ ان پودوں اور جڑی بوٹیوں کے حالات اپنی کتاب میں درج کرتے تھے ورنہ نہیں، اس علم میں مسلمانوں کی دل چسپی کا ایک اور سبب یہ تھا کہ یونانی علم الادویہ کے ایک بہت بڑے سائنس داں DIOSCORIDES کی مشہور کتاب MATERIA MEDICA کا عربی میں ترجمہ ہوگیا تھا، اس میں ان جڑی بوٹیوں پر جو دواؤں کے طور پر استعمال ہوتی تھیں، کافی معلومات پائے جاتے تھے یہ مسلمانوں کے لیے علم الادویہ پر بنیادی ماخذ تھا، اس کی اہمیت کے پیش نظر اس کا دوسرا ترجمہ اندلس میں مشہور طبیب ابن جلجل نے کیا تھا۔

ص ۷۵، س ۹/۱۰: الغافقی کے بارے میں ایک اہم اطلاع یہ ہے کہ جب راقم نے نیتیسواں بین الاقوامی CONGRESS OF ASIAN AND NORTH AFRICAN STUDIES جو اگست ۱۹۹۰ میں ٹورینٹو، کنیڈا میں منعقد ہوئی تھی، شرکت کی تھی، وہاں یونی ورسٹی لائبریری میں ان (۱) کی نظر الغافقی کی کتاب الادویۃ المفردۃ کے ایک مکمل اور نادر مخطوطے پر پڑی جس کا انہوں نے مطالعہ کیا، اس پر ان کا مقالہ انگریزی اور اردو میں بہت جلد شائع ہونے والا ہے۔

ص ۷۸: اشبیلیہ کے محمد بن العوام کا ذکر ابن البیطار کے قبل کرنا چاہیے تھا نہ کہ اس کے بعد، ابن العوام کا انتقال ابن البیطار کے ۵۸ سال قبل ہوا (وفات ۱۲۴۸/۶۴۶) یہ لکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، اسلام نے ان (۲) کی کتاب الاموال کا اردو ترجمہ شائع کر دیا ہے، اس کے مترجم کا نام عبدالرحمان سورتی ہے، ڈاکٹر غلام جیلانی برق نے اپنی کتاب یورپ پر اسلام کے احسانات (LAHORE 1964) میں ابن البیطار کے حالات ابن العوام کے بعد بیان کیے ہیں جو صحیح ہے۔

ص ۸۱: کتاب کی ضخامت کو شاید زیادہ کرنے کے لیے مصنف کی عام عادت یہ ہے کہ وہ یورپین مصنفین کی کتابوں سے انگریزی میں عبارات نقل کرتے ہیں، ان کے ساتھ ساتھ ان کا لفظی اردو ترجمہ بھی شامل کرتے ہیں، جب کہ اردو ترجمہ ہی کافی تھا لیکن یہ اردو ترجمہ اکثر غلط

(۱) معارف: کیا ''ان'' سے مراد حکیم محمد سعید ہیں؟ واضح نہیں، کتاب الاموال ابوعبید کی مشہور کتاب ہے۔

ہوتا ہے یہ افسوس کی بات ہے کہ VALENCIA کا ترجمہ بالکل غلط ملیشیہ کیا گیا ہے VALENCIA اصل میں MEDITERREAN SEA کے مغربی حصے میں اندلس کے مشرقی ساحل پر واقع ہے، عربی میں اس کا نام بالنسیہ ہے جو ایک علمی و ادبی مرکز تھا اور جو ۷ ۱۱۴ تک آزاد تھا لیکن بعد میں CID نے اسے فتح کر لیا تھا، اس میں ایک شان دار مسجد بھی ہے، ملیشیہ، بالنسیہ سے بہت دور جنوبی ایشیا میں واقع ہے جو دراصل MALYSIA کہلاتا ہے، اسی طرح MAJORCA کا میورقہ ترجمہ کیا ہے جو غلط ہے، MEDITERRANEAN SEA کے مغربی حصے میں اندلس (SPAIN) کے مشرقی ساحل کے قریب تین جزیروں میں سے ایک تھا جسے عربی میں میورقہ کہا جاتا ہے، اس طرح کی بے شمار غلطیاں اس کتاب میں موجود ہیں، ان سب کی نشان دہی کرنا اس تبصرے میں ممکن نہیں ہے۔

ص ۸۶: اس پر حوالہ نمبر ۱۲ میں صرف انسائیکلوپیڈیا آف اسلام لکھا ہے جس کے دو ایڈیشن ہیں، ایک پہلا ایڈیشن اور ایک نیا، دراصل یہ نیا ایڈیشن کا حوالہ ہے جس کی پہلی جلد ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی تھی اور صفحات کا حوالہ نامکمل ہے، بی-لیوین کا مقالہ ادویہ پر ص ۲۱۲ سے ص ۲۱۴ تک ہے، اسی طرح بہت سے حواشی اور حوالہ جات ناقص اور نامکمل ہیں، حوالہ یا حواشی ایک مستقل سائنس ہے جسے لکھنے کا ایک سال کا ایک کورس مغربی ممالک اور امریکا کی یونی ورسٹیوں میں پڑھایا جاتا ہے۔

ص ۸۸ سے ۱۱۰: علم الحیوانات کے باب کو مصنف نے قصے کہانیوں سے بھر دیا ہے اور اس میں تفصیل سے علم الحیات BIOLOGY اور نظریہ ارتقا یعنی THEORY OF EVOLUTION سے بحث کی ہے، خاص طور پر ڈارون کے نظریے پر تبصرہ کیا ہے جو ۱۸۵۹ء میں شائع ہوا تھا، اسلامی نقطۂ نگاہ سے اس نظریے کی تحقیق کیمبرج کے THE ISLAMIC ACADEMY کے موجودہ ڈائرکٹر ڈاکٹر عبدالمعبود صاحب نے اپنی کتاب THEURY OF EVOLUTION میں کی ہے، اس میں انہوں نے صرف قرآن اور حدیث سے استفادہ کیا ہے اور ارتقا پر جو بحث کی ہے اس میں مشہور مسلمان مفکرین کے نظریات کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔

جاحظ اور الدمیری دونوں کی کتابوں کا نام کتاب الحیوان ہے، ان کا تقابلی مطالعہ

کر کے ان کی خاص خصوصیات پر بہت مختصر تبصرہ کرنا چاہیے تھا، مسکویہ کے نظریہ ارتقا کے بارے میں مزید یہ لکھنا تھا کہ ان کی الفوز الاصغر ایک مختصر سی کتاب ہے جس میں صرف تین باب ہیں جس کے تیسرے اور آخری باب میں نظریہ ارتقا پیش کیا گیا ہے جس کا عنوان ہے ''نبوت''، ان کا یہ نظریہ بنیادی طور پر BIOLOGICAL ہے جو اصل میں یونانی ہے۔

راقم کو یاد آتا ہے کہ جب وہ جرمنی میں پڑھا کرتا تھا تو ایک جرمن عالم FREDERICH DIETRICH کی کتاب پڑھی تھی، ہمارے مصنف نے اس کتاب کا نام لکھا ہے لیکن یہ جرمن زبان میں بالکل مسخ ہوگیا ہے (ص ۱۰۸)، اس کا صحیح نام ہے DER DARWINUSMUS IM ZEHTEN AND NEUNZEHNTEN JAHRHUN DERTHUNDERT یعنی ''ڈارون کا نظریہ دسویں اور انیسویں صدی عیسوی میں'' جس کے نویں باب میں انہوں نے مسلمان فلسفیوں کے بارے میں لکھا ہے وہ نظریہ یہ ہے کہ معدنیات، نباتات اور حیوانات کی منزلیں طے کر کے انسان کا وجود عمل میں آیا ہے، یہ نظریہ ارتقا مسلمانوں کو معلوم تھا اور وہ اسے دسویں صدی عیسوی میں پیش کر چکے تھے۔

ص ۹۵: جہاں گیر ایک بہت بڑے ماہر حیوانات و نباتات یعنی NATURALIST تھے جن پر چند جملے کافی نہیں ہیں، یہ لکھنا مناسب ہے کہ وہ بہت بڑے ORNITHOLOGIST یعنی پرندوں کے انواع، عادات ساخت وغیرہ کا بہت صحیح علم ذاتی مشاہدہ کی بنا پر رکھتے تھے، اسی لیے Dr. SALIM ALI نے ان پر مضمون لکھا ہے، ایم۔اے علوی اور اے رحمان صاحبان نے ایک کتاب JAHANGIR-THE NATURALISH نئی دہلی کے INDIAN NATIONAL SCIECE ACADEMY سے ۱۹۶۸ء میں شائع کی تھی (ص ۱۶۵)، اس میں توزک جہاں گیری کے ان موضوعات سے متعلقہ عبارتیں کثرت سے نقل کی گئی ہیں۔

ص ۱۰۱: یہ پڑھ کر راقم کو دکھ ہوا کہ فریڈرک دوم کو جرمنی کا بادشاہ لکھا گیا ہے، دراصل وہ سسلی کے فرماں روا تھے جن کا دار السلطنت پالرمو تھا یہ صحیح ہے کہ مشہور جغرافیہ داں الادریسی پالرمو کے نارمن بادشاہ راجر ثانی کے دربار سے منسلک تھے اور جن کے نام انہوں نے اپنی جغرافیہ کی کتاب نزهة المشتاق فی اختراق الآفاق معنون کی تھی۔

ص ۱۰۷: راقم کی رائے میں مولانا روم یا بیدل عظیم آبادی کے اشعار نقل کرنا غیر ضروری ہے۔

ص ۱۱۱ سے ۱۲۲: یہ مختصر باب علم الکیمیا پر ہے، خالد بن یزید کی کتابوں کے بارے میں سائنس کے مورخین کی عام رائے یہ ہے کہ یہ ان کی تصنیف نہیں ہیں، اسی طرح امام جعفر الصادق سے جو کتابیں منسوب ہیں وہ بھی ان کی تصنیف تسلیم نہیں کی جاتی ہیں اور بعد میں لکھی گئی ہیں، خالد بن یزید کی تاریخ وفات اگر ۸۵ھ ہے تو عیسوی سن کے مطابق یہ ۷۰۴ء ہونی چاہیے تھی لیکن شاید کتابت کی غلطی سے ۴۰۷ء چھپ گئی ہے۔

یہ صاف طور پر لکھنا چاہیے تھا کہ الکیمیا جدید کیمسٹری سے بہت مختلف علم تھا مصنف نے ان دونوں کے فرق کو واضح نہیں کیا، زمانہ وسطی میں الکیمیا سے علما کی دل چسپی دو سبب سے تھی، پہلا یہ کہ مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ یہ یقین رکھتا تھا کہ معمولی دھاتوں کو خاص عمل کے ذریعہ سونا بنایا جاسکتا ہے، اسی وجہ سے یہ طبقہ سونا بنانے کا عمل جاننے کے لیے الکیمیا سیکھتا تھا لیکن اکثر وہ اس میں کامیاب نہیں ہوتا تھا اس دل چسپی کا دوسرا سبب یہ تھا کہ کچھ لوگ ایک خاص عمل سے الاکسیر بنانا چاہتے تھے جس سے ضعیفی پر قابو پایا جاسکتا تھا اور حیات جاوداں یعنی ETERNAL LIFE حاصل ہوسکتی تھی، انگریزی کا لفظ ELIXIR، الاکسیر سے ماخوذ ہے لیکن چند علما علم الکیمیا پر بالکل یقین نہیں رکھتے تھے، دو بہت اعلا مسلمان فلسفی، طبیب اور سائنس داں یعنی ابن سینا اور البیرونی کو علم الکیمیا کی ''جادوگری'' پر یقین نہیں تھا لیکن ان کے برعکس الرازی ایک بہت بڑے طبیب تھے جن کی طب کی کتاب ۲۲ جلدوں میں شائع ہوچکی ہے، ان کی سوانح حیات میں لکھا ہے کہ وہ سونا بنانے کے عمل میں ایک حادثے کا شکار ہوئے اور اپنی دونوں آنکھوں سے محروم ہوگئے، جابر ابن حیان الکیمیا کے بہت بڑے ماہر کی حیثیت سے مشہور ہیں، ان کو صوفی بھی کہا جاتا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ جو کتابیں ان سے منسوب کی گئی ہیں ان کا اثر قرون وسطی کے یہودی اور عیسائی سائنس دانوں پر پایا جاتا ہے، یہ صحیح ہے کہ ان کے بارے میں مصنف نے بہت تفصیل سے لکھا ہے، جابر کا سن وفات اس کتاب میں ۸۰۳ عیسوی لکھا ہے لیکن مصنف کو ۱۸۸ھ میں لکھنا چاہیے تھا۔

اس باب میں یہ واضح کرنا چاہیے تھا کہ عربی الکیمیا بنیادی طور پر یونانی الکیمیا کی ان کتابوں سے ماخوذ ہیں جن کا ترجمہ کیا گیا تھا۔

اس علم پر لکھنے والے بہت سے عرب مصنفین کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، ذوالنون المصری (المتوفی ۲۴۶/۸۷۱) کا اس باب میں ذکر نہیں ہے ان کی دو کتابوں کا نام ابن الندیم نے اپنی کتاب الفہرست میں لکھا ہے، ان کے علاوہ ابوالقاسم العراقی الجلدکی کے نام اس باب میں شامل نہیں، اس علم کے مخالفین میں ابن سینا اور البیرونی کے علاوہ ابوحیان التوحیدی اور مشہور مورخ ابن خلدون بھی ہیں اور بعض نے اس کے رد میں کتابیں بھی لکھی ہیں اور موخر الذکر نے اپنے مشہور مقدمہ کا چھبیسواں باب اس کے رد میں لکھا ہے، اسی طرح مغربی علما کا نام تک نہیں لیا گیا ہے جنہوں نے عربوں کے علم الکیمیا پر کتابیں لکھی ہیں مثلاً کراؤس رسکا (RUSKA) فسٹو گبر، المان، سزگین وغیرہ۔

عربی الکیمیا کا اثر یورپ پر بہت گہرا اور دیرپا رہا، اس پر کوئی اختلاف رائے نہیں ہوسکتا کہ الکیمیا کے مختلف عمل نے موجودہ کیمسٹری کی ترقی و ترویج میں مدد کی اور عربوں کی الکیمیا سے دل چسپی نے جدید کیمسٹری کو جنم دیا ہے لیکن دھاتوں کے پراسرار، تغیر اور الاکسیر حاصل کرنے کی کوشش سے کیمسٹری کا کوئی تعلق نہیں ہے اور دونوں کے فرق کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نہ مصنف نے سمجھا ہے نہ اس کو واضح کیا ہے، اس کے علاوہ انہوں نے فرسودہ ثانوی ماخذ پر پورا بھروسہ کیا ہے، ENCYCLOPEDIA OF ISLAM میں المان کا الکیمیا پر ایک بصیرت افروز مقالہ ہے جسے مصنف نے نظر انداز کر دیا ہے (دیکھیے نیا اڈیشن جلد ۵، ۱۹۸۶ء، ص ۱۱۰-۱۱۵ تک)، ان خامیوں کے علاوہ اس باب میں مغربی علما کی ثانوی انگریزی کتابوں سے یا ان کے ترجموں سے بہت سی عبارتیں نقل کی گئی ہیں لیکن ان کے حوالے نہیں دیے گئے ہیں۔

اس کتاب میں اتنی غلطیاں ہیں کہ ص ۱۲۲ تک بھی سب کی نشان دہی کرنا ممکن نہ تھا، راقم نے طوالت کے خوف سے بہت سی غلطیوں کو نظر انداز کر دیا ہے، تاہم کتابت اور بعض دوسری نوعیت کی غلطیاں بہت ہیں جن میں سے چند کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

ص ۱۹: تاریخ دمشق کا ذکر کیا گیا ہے لیکن اس کے مصنف ابن عساکر کا نام دینا

ضروری تھا، یہ نہیں لکھا گیا ہے کہ اس کو ایڈٹ کر کے المجمع العلمی العربی دمشق نے شائع کرنا شروع کیا ہے، اس ادارے سے ایک بہت اعلا معیار کا مجلہ شائع ہوتا ہے، اس کے ایک شمارے سے معلوم ہوا کہ ۲۰۰۱ء تک اس کی ۵۱ ویں جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

ص ۲۱: ابن خلدون کے بارے میں مصنف نے لکھا ہے کہ افلاطون اور ارسطو بھی اس کے ہم پلہ نہ تھے یہ ARNOLD TOYNBEE کا قول ہے جو راقم کی نظر میں صحیح نہیں ہے۔

ص ۲۳: ادیان کے تقابلی مطالعہ کے بارے میں لکھا ہے کہ ابن حزم کی کتاب الفصل فی الملل والاھواء والنحل سے اختلاف کی کافی گنجائش ہے لیکن مصنف نے اس کی وضاحت نہیں کی، اس کتاب کا جناب غلام حیدر آسی کا انگریزی ترجمہ اور مطالعہ اسلام آباد سے چھپ گیا ہے اور شہرستانی کی کتاب کے ایک باب کا امریکن BRUCE B. LAWRENCE نے انگریزی میں اپنا مطالعہ شائع کیا تھا۔

سوانح نگاری بے شک تاریخ نگاری کا ایک حصہ ہے، ابن خلکان کی مشہور کتاب وفیات الاعیان کا ذکر کیا گیا ہے لیکن یہ نہیں لکھا ہے کہ صرف متوفیوں کی سوانح حیات پر مبنی ہے، اس کا تکملہ صلاح الدین خلیل ابن ایبک الصفدی نے مرتب کیا ہے، جس کی ۱۵ جلدیں راقم کی لائبریری میں موجود ہیں مزید یہ کہ یہ بھی لکھنا چاہیے کہ ہر عظیم متوفی شخص کی وفیات یعنی OBITUARY لکھنے کا چلن مغرب نے مسلمانوں سے سیکھا ہے۔

ص ۲۶: یہ بات راقم کی سمجھ سے بالاتر ہے کہ مصنف نے سخاوی کی الاعلان کے لیے ڈاکٹر سید محمد یوسف کے اردو ترجمے کا حوالہ کیوں دیا ہے جبکہ FRANZ ROSENTHAL کی کتاب میں اس کا پورا عربی متن ان کے سامنے تھا، اس صفحے پر MACMILLAN پریس کا نام غلطی سے MECANILLAN چھپ گیا ہے۔

ص ۲۹: جغرافیہ داں الہمدانی کو الحمدانی لکھنا صحیح نہیں ہے۔

ص ۲۹: البکری کی کتاب کا نام کتاب المسالک والممالک ضرور تھا لیکن اور چند جغرافیہ دانوں نے بھی اپنی کتاب کا یہی نام رکھا تھا، اس سلسلے میں یہ اضافہ کرنا مناسب ہے کہ پروفیسر نفیس احمد کی ایک مشہور کتاب MUSLIM CONTRI BUTION TO GEOGRAPHY

ہے جو بہت معلومات افزا ہے۔

ص ۷۳: ابوحنیفہ الدینوری جو تاریخ اسلام الاخبار الطوال کا مصنف ہے، اس نے بے شک کتاب النبات لکھی ہے لیکن مصنف نے یہ نہیں لکھا کہ یہ کتاب علم النباتات سے زیادہ لغوی معلومات کے لیے اہم ہے اور B. LEWIN اور دوسرے علما نے اسے ایڈٹ کرکے شائع کردیا ہے۔

ص ۸۴: اندلس کے باغوں کا ذکر کیا گیا ہے لیکن جنۃ العریف کا ذکر نہیں، یہ سلاطین غرناطہ کے مشہور محل کا ایک نہایت خوبصورت باغ تھا جسے ہسپانوی زبان میں GENERALIFE کہتے ہیں جو واقعی جنت نظیر تھا، اندلس کی تاریخ وثقافت پر دو بہت اہم کتابیں سلمی خضرا جیوشی کی THE LEGACY OF MUSLIM SPAIN (لائیڈن بریل ۱۹۹۲، ص ۱۰۹۸) اور ڈاکٹر صاحب زادہ ساجد الرحمن کی ''اندلس کی اسلامی میراث'' (اسلام آباد ۱۹۹۶، ص ۷۹۰) جو حال ہی میں شائع ہوئی ہیں، ان کا علم شاید مصنف کو نہیں ہے۔

ص ۸۷: ''عہد اسلامی میں ٹکنالوجی'' ایک انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ ہے لیکن اس کے اصل مصنف کا نام DONALD HILL ہے جسے کاتب نے بالکل مسخ کرکے ''ڈومالڈہل'' کردیا ہے لیکن ص ۱۹۲ پر یہ نام صحیح چھپا ہے۔

ص ۹۲ و ۹۳: گھوڑوں پر لکھی گئی کتابوں کے ذکر میں ایک فارسی کتاب کا حوالہ بھی دیا جاسکتا تھا، جو سلطان التتمش کے زمانے میں ہندوستان میں لکھی گئی تھی، اس کا موضوع ہے جنگ کے آداب واصول اور اس کا نام ''کتاب آداب الحرب الشجاعۃ'' ہے، جس کے مصنف فخر مدبر ہیں، اس میں چھ باب گھوڑوں پر بہت اہم موجود ہیں۔

ص ۹۴: مشہور عرب شاعر کا نام الکشاجم ہے لیکن الکشاخم چھپا ہے جو کتابت اور طباعت کی فاش غلطی ہے۔

ص ۹۵: PLINY کو پلینی لکھنا چاہیے تھا پلائنی لکھنا صحیح نہیں ہے، مصنف نے جانوروں کے عجیب وغریب عادات کے بارے میں جو قصے درج کیے ہیں وہ سائنس کی تاریخ کے لیے مناسب نہیں ہیں بلکہ وہ قصے، کہانیوں کی کتابوں کے لیے موزوں ہیں۔

ص ۹۶: پر یہ جملہ بالکل غیر ضروری اور اس کتاب کے لیے قابل اعتراض ہے،

''حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جاحظ نے بعض جانوروں کی ان جنسی بے راہ رویوں کی تفصیلات بھی بیان کی ہیں'' جو آج یورپ، امریکہ کے بعض انسان نما جانوروں میں عام ہورہی ہیں''۔

ص ۹۸ و ۹۹: یہ صحیح ہے کہ اسلام نے تعلیم دی ہے کہ جانوروں پر ظلم وستم روا نہ رکھا جائے لیکن مرض کی تشخیص اور علاج کے لیے مسلمان طبیب انسانی جسم کے بجائے بندروں کو چیرتے پھاڑتے تھے کیوں کہ انسانی جسم کو DISSECTION کی اجازت نہ تھی۔

ص ۱۰۳: علم الحیوانات ZOOLOGY اور حیاتیات BIOLOGY دو الگ علم ہیں لیکن مصنف نے دونوں کو خلط ملط کردیا ہے، اخوان الصفا کے کس رسالے کے کون سے صفحے پر نظریہ ارتقا کی بحث کی گئی ہے، ان کا حوالہ دینا ضروری تھا۔

ص ۱۰۴: مسعودی کے نظریہ ارتقا کا ذکر کیا گیا ہے لیکن مصنف نے ویل دوران کی فرسودہ کتاب THE AGE OF FAITH کا حوالہ دیا ہے، مسعودی کی کتاب ''التنبیہ والاشراف'' آسانی سے ملتی ہے، اس کتاب کے صفحے کا حوالہ دینا چاہیے تھا۔ (دیکھیے دے خونے کا ایڈیشن طبع ثانی، مکتبہ خیاط بیروت، ۱۹۶۵، ص ۴۰۱)

ص ۱۰۵ و ۱۰۶: مصنفوں اور ان کی کتابوں کا حوالہ دینے میں وفات کی تاریخ کے تسلسل کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، نظامی عروضی، سمرقندی (متوفی تقریباً ۱۱۶۰ء) کے بعد مصنف نے الجاحظ کا نظریہ ارتقا پیش کیا ہے جن کی سال وفات ۲۵۶ / ۸۶۹ ہے، اس لحاظ سے ان دونوں کی وفات میں تین سو سال کا فرق ہے۔

ص ۱۱۴: علم الکیمیا پر جو باب ہے اس میں بہت سے ادق عربی کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جو اس علم سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً تحلیل، تقصیر، تبخیر، کشید، تبلور، تکلیس، تصعید وغیرہ وغیرہ، ان لفظوں کے ساتھ ساتھ اگر ان کے انگریزی مترادف الفاظ بھی دے دیے جاتے تو قارئین کو سمجھنے میں دشواری پیش نہیں آتی، اور یہ بھی ظاہر ہوجاتا کہ ان میں سے زیادہ تر الفاظ عربی زبان سے ماخوذ ہیں، مثلاً اکسیر = ELIXIR، الکحل = ALCOHAL، الکیمیا = AL-CHEMY، شکر = SUGAR، اثمد = ANTIMONY، قلی = ALKALI۔

اگر سائنس سے متعلق مغربی زبانوں میں مستعمل الفاظ جو عربی سے ماخوذ ہیں درج

کردیے جاتے تو حقیقت واضح ہوجاتی کہ مغربی سائنس داں کس حد تک مسلمان سائنس دانوں کے رہین منت ہیں، علم الکیمیا کے الفاظ جو اوپر درج کیے گئے ہیں وہ ابوبکر محمد بن زکریا الرزای کے کیمیاوی عمل ہیں جن کی اس نے اپنی کتابوں میں تشریح کی ہے یعنی تقصیر = DISTILLATION، تقلس = CALCINATION، التحلیل = SOLUTION، التبخیر = EVAPORATION، تبلور = CRYSTALLIZATION، تصعید = SUBLIMATION، الترشیح = FILTRATION، تلغیم = MALGANATION، ۱۹۹۶ء میں سائنس کے مشہور مورخ رشدی راشد نے ایک کتاب ENCYCLOPEDIA OF THE HISTORY OF ARABIC SCIENCES تین جلدوں میں لندن سے شائع کی ہے، اس کی تیسری جلد میں دو مقالے میں ایک مقالہ عربی الکیمیا پر ہے اور دوسرے مقالے کا موضوع ہے، الکیمیا کا اثر مغرب پر، اس کتاب کا علم مصنف کو نہیں ہے۔

ص ۱۲۲: پر ہم نے اپنی بحث ختم کردی تھی لیکن اور جن غلطیوں پر اتفاقاً نظر پڑ گئی ان کی نشان دہی کرنا بہت مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ص ۲۳۴: ثابت ابن قرہ کو مسلمان لکھا گیا ہے، دراصل وہ صابی تھے، اس فرقے کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے۔

ص ۳۱۱: پر الکندی کی کتابوں کی تعداد-۳۶۱ لکھی گئی ہے، اس کا حوالہ نہیں دیا گیا لیکن راقم نے یہ کہیں کسی کتاب میں نہیں پڑھا، جارج عطیہ کی انگریزی کتاب الکندی (راول پنڈی، ۱۹۶۶ء، ص ۲۷۲) نے سب ملا کر ۲۷۰ کتابیں اور رسالے ان کی طرف منسوب کیے ہیں، ڈاکٹر عبدالرحمن شاہ ولی کی عربی کتاب الکندی و آراءہ الفلسفیۃ (اسلام آباد، ۱۹۷۴ء، ص ۴۸۴) میں بھی ان کی کتابوں کی تعداد ۳۶۱ نہیں ہے، اگر مصنف اس کے مآخذ کی نشان دہی کردیتے تو اچھا تھا۔

ص ۳۵۲: پر زکی مبارک کو ترکی مبارک لکھا گیا جو غلط ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے ادب، علوم و فنون، فلسفہ و سائنس کی ترقی و ترویج میں زمانہ وسطی میں اہم خدمات انجام دیے ہیں خصوصاً سائنس میں ان کی امتیازی خدمات کی وجہ ہی سے اس میں غیر معمولی ترقی ہوئی اور جدید سائنس کی ایجادات ہمارے سامنے رونما ہوئی، جس کی

وجہ سے مغرب میں نشاۃ ثانیہ کا دور ممکن ہوا سائنس کے بہت سے علوم میں مسلمانوں کو اولیت کا شرف حاصل ہے جن میں ان کی قوت تخلیق کارفرما تھی مسلمانوں کی سائنس کی عربی کتابوں کا لاطینی اور عبرانی زبانوں میں ترجمہ ہوا اور یہ سائنسی علوم مغرب میں منتقل ہوگئے اس طرح سائنس کے ہر شعبے میں مغرب نے مسلمانوں سے بہت کچھ سیکھا ہے لیکن اس کا اعتراف نہیں کیا جاتا تھا۔

مغرب میں سائنس کی تاریخیں اکثر کئی کئی جلدوں میں لکھی جارہی ہیں، قرون وسطی میں مسلمانوں نے سائنس کی ترقی و ترویج میں جو حصہ لیا تھا ان کی خدمات کی اہمیت کا ان تاریخوں میں اب اعتراف کیا جاتا ہے اور ان کو سراہا جاتا ہے کسی کتاب میں تفصیلی طور پر اور کسی میں مختصر۔

زمانہ وسطی میں مسلمانوں کی سائنسی خدمات کے موضوع پر اب مسلمانوں نے بھی کتابیں لکھنی شروع کردی ہیں اس سلسلے کی چند کتابوں کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ان کے علاوہ کچھ اور کتابوں کے نام بھی راقم کے علم میں آئے ہیں، مثلاً ایک کتاب ہے "علوم عرب غیر مسلموں کی نظر میں" مولفہ مولانا عبدالباطن صاحب جونپوری (۱۹۵۴ء، ناشر انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ص ۱۴۳) اس میں اسے واضح کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کی سائنسی خدمات کے بارے میں غیر مسلم علما، سائنس داں اور مورخین کیا رائے ظاہر کرتے ہیں، دوسری کتاب ہے "سائنس میں مسلمانوں کی خدمات" جسے جناب عطش درانی نے لکھی ہے جو فردوس پبلی کیشنز دہلی سے ۱۹۸۲ء میں چھپی تھی ص ۵۴ لیکن اس چھوٹی سی کتاب میں حوالے نہیں ہیں، راقم کو اس کا اعتراف ہے کہ اس موضوع پر بہت سی کتابیں اردو میں لکھی گئی ہیں، جن کا علم اس کو نہیں ہے۔

اردو کے علاوہ عربی، فارسی اور ترکی میں بھی مسلمانوں کی سائنسی خدمات کی تاریخیں لکھی جارہی ہیں، خاص طور سے عربی میں قرون وسطی میں لکھی ہوئی سائنس کی تاریخ کی بہت اہم عربی کتابوں کا ذکر گذر چکا ہے ان کے علاوہ مسلمان انگریزی، فرنچ، جرمن، ہسپانوی اور دوسری مغربی زبانوں میں بھی سائنس میں مسلمانوں کی خدمات کی تاریخ لکھ رہے ہیں لیکن ان تاریخوں اور ان کے مصنفین کے نام طوالت کے خوف سے نہیں لکھے جاسکتے۔

اردو زبان میں سائنس سے متعلق کتابیں اور مضامین کم ہیں، کیونکہ سائنسی علوم پر عام طور سے اردو میں کتابیں کم لکھی جارہی ہیں، اگر چہ یہ سائنس کا دور ہے، لیکن سائنس میں جو فی الحال

ترقی ہوئی ہے اس کی تفسیر اردو کتابوں میں عام طور سے نہیں ملتی ہے۔

ماضی میں مسلمانوں نے جو سائنسی خدمات انجام دی ہیں، ان کی تاریخ لکھنا ایک نیک فال ہے، کیونکہ اپنے آباواجداد کے ماضی کے کارناموں کو یاد رکھنا اور ان پر فخر کرنا صحیح بھی ہے اور ضروری بھی جب کسی قوم کے عروج کا دور ختم اور زوال شروع ہوجائے تو اس وقت نہ صرف عروج کے اسباب بلکہ زوال کے اسباب بھی جاننا ضروری ہوجاتا ہے، اس سے ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے، خصوصاً سائنس میں مسلمانوں کے زوال کے اسباب جاننا بہت ضروری ہے۔ اس موضوع پر ایک بین الاقوامی سمینار میں راقم کو بھی شرکت کرنے کا موقع ملا تھا۔

" سائنس کی تاریخ میں مسلمانوں کا حصہ" اس موضوع پر جتنی بھی اردو کتابیں آج تک لکھی گئی ہیں، ان میں تحقیق و تفتیش کے جدید اعلا اصولوں کے پیش نظر یہ کتاب کارآمد کہی جاسکتی ہے، کیوں کہ ڈاکٹر عبدالقادر لون نے اپنے بڑی محنت اور جانفشانی سے لکھی ہے اور اپنا بہت ہی قیمتی وقت اس کے لکھنے میں صرف کیا ہے، اس لحاظ سے وہ اس کتاب کے قارئین کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

☆☆☆☆

سورۂ انبیا کی ایک آیت

از:- جناب محبوب الرحمن فاروقی ☆

سورۂ انبیا کی حسب ذیل آیت زیر بحث ہے:

اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ	اور جو لوگ کفر (اختیار) کیے ہوئے ہیں
وَالْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا	انہیں علم نہیں کہ آسمان و زمین ایک ہیولا تھا،
وَجَعَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ	پھر ہم نے دونوں کو توڑ کر الگ کردیا اور ہم
اَفَلَا یُؤْمِنُوْنَ ٥ (انبیا-۲۱:۲۹و۳۰)	نے پانی سے ہر جاندار چیز کو بنایا۔

اس لحاظ سے ترجمہ یہ ہوتا ہے کہ آسمان زمین جڑے ہوئے تھے پھر ہم نے پھاڑ کر دونوں کو الگ کردیا گویا بتایا یہ جارہا ہے کہ سارا تودۂ کائنات ایک ہیولا کی شکل میں تھا، یعنی ابتداءً وہ ایک مخلوط عظیم الشان تودہ ایک بھنڈا تھا کوئی فضا یا خلا درمیان میں نہ تھی پھر اللہ نے اپنے دست قدرت سے اس وحدت میں تعدد پیدا کیا، زمین و آسمان الگ الگ کرکے بنائے۔

اور قرآن مجید نے صیغۂ واحد استعمال کیا ہے رتقاً ایک تودہ یا ہیولا تھا جس سے یہ نکلا کہ دو تودے نہیں تھے، اسی لیے علاوہ دوسرے مفسرین کے تابعین کی ایک جماعت بہ شمول ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباس صحابی اس طرف گئے ہیں کہ ابتداءً ساری کائنات ایک ہی تودہ تھی پھر ہوائی فضا پیدا کرکے انہیں جدا جدا کیا گیا"۔ (مولانا عبدالماجد دریابادی: تفسیر ماجدی)

" جو لوگ منکر ہیں کیا انہوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ آسمان اور زمین دونوں اپنی ابتدائی خلقت میں ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے پھر ہم نے الگ الگ کیا اور پانی سے تمام جاندار چیزیں پیدا کردیں پھر کیا یہ اس بات پر یقین نہیں رکھتے"۔

تشریح: قرآن کا عام اسلوب موعظت یہ ہے کہ توحید ربوبیت و خالقیت سے یہ الوہیت پر استدلال کرتا ہے، چنانچہ اس آیت میں فرمایا: کیا منکرین حق اس بات پر غور نہیں کرتے کہ کس

☆ سابق مدیر "آج کل"، بٹلا ہاؤس جامعہ نگر، نئی دہلی۔

قدرت وحکمت نے یہ تمام کارخانہ خلقت پیدا کیا ہے اور کس کی ربوبیت نے اسے زندگی اور زندگی کی ساری احتیاجوں کے لیے اس درجہ اوفق واصلح بنادیا، اس طریق استدلال کی تشریح تفسیر فاتحہ میں ملے گی، تخلیق کائنات کی جو حالت یہاں بیان کی گئی ہے اس کی تشریح سورۂ یونس کے آخری نوٹ میں گزرچکی ہے۔

سورۂ یونس: آسمان اور زمین کی پیدائش ایک ایسے مادہ سے ہوئی ہے جسے قرآن دخان کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے، دخان کے معنی دھویں کے ہیں، ایسی بھاپ جو اوپر چڑھی ہوئی ہے، یہ مادہ دخانیہ ابتدا میں ملا ہوا تھا الگ الگ نہ تھا پھر اس کے مختلف حصے ایک دوسرے سے جدا کردیے گئے اور ان میں اجرام سماویہ کی پیدائش ظہور میں آئی۔

ماحصل یہ ہے کہ ابتدا میں مادہ دخانی تھا پھر اس میں انقسام ہوا، یعنی بہت سے ٹکڑے الگ الگ ہوگئے پھر ہر ٹکڑے نے کرہ کی شکل اختیار کرلی اور اسی کے ایک ٹکڑے سے زمین بنی پھر زمین میں کوئی ایسی تبدیلی واقع ہوئی کہ دخانیت نے مائیت کی شکل اختیار کرلی یعنی پانی پیدا ہوگیا۔

"موجودہ زمانے میں اجرام سماویہ کی ابتدائی تخلیق اور کرۂ ارض کی ابتدائی نشو ونما کے جو نظریے تسلیم کرلیے گئے ہیں، یہ اشارات بہ ظاہر ان کی تائید کرتے ہیں اور اگر ہم چاہیں تو ان بنیادوں پر شرح وتفصیل کی بڑی بڑی عمارتیں اٹھاسکتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا کرنا صحیح نہ ہوگا، یہ نظریے کتنے ہی مستند تسلیم کرلیے گئے ہوں لیکن پھر نظریے ہیں اور نظریات جزم ویقین کے ساتھ حقیقت کا فیصلہ نہیں کرسکتے، فرض کرو آج ہم نے دخان اور دخان کے انقسام کا مطلب اسی روشنی میں آراستہ کردیا جو وقت کے نظریوں میں تسلیم کیا جاتا ہے لیکن کل کو کیا کریں گے اگر ان نظریوں کی جگہ دوسرے نظریے پیدا ہوگئے، صاف بات یہ ہے کہ یہ معاملہ عالم غیب سے تعلق رکھتا ہے جس کی حقیقت ہم اپنے علم و ادراک کے ذریعہ معلوم نہیں کرسکتے اور قرآن کا مقصود ان اشارات تخلیق عام کی تشریح وتحقیق نہیں ہے، خدا کی قدرت وحکمت کی طرف انسان کو توجہ دلانا ہے۔" (مولانا ابوالکلام آزاد: ترجمان القرآن، ج ۳-۴)

"کیا وہ لوگ جنہوں نے "نبی کی بات ماننے سے انکار کردیا غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے پھر ہم نے انہیں جدا کیا اور پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی"۔

۲۸-۲۹: اصل لفظ رتق اور فتق کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، رتق کے معنی ہیں یکجا

ہونا، اکٹھا ہونا، ایک دوسرے سے جڑا ہونا، متصل اور متلاحق ہونا اور فتق کے معنی پھاڑنے اور جدا کرنے کے ہیں، بہ ظاہر ان الفاظ سے جو بات سمجھ میں آتی ہے کہ کائنات کی ابتدائی شکل ایک تودے Mass کی سی تھی بعد میں ان کو الگ الگ حصوں میں تقسیم کرکے زمین اور دوسرے اجرام فلکی جدا جدا دنیاؤں کی شکل میں بنائے گئے۔

۲۹-۳۰: اس سے جو مفہوم سمجھ میں آتا ہے کہ پانی کو خدا نے سبب زندگی اور اصل حیات بنایا اسی میں اور اسی سے زندگی کا آغاز کیا۔

قدیم زمانے میں لوگوں کے لیے آسمان اور زمین کے رتق وفتق اور پانی سے ہر زندہ چیز کے پیدا کیے جانے اور تاروں کے ایک ایک فلک میں تیرنے کا مفہوم کچھ اور تھا، موجودہ زمانے میں طبیعات، حیاتیات اور علم ہیئت کی جدید معلومات نے ہمارے لیے ان کا مفہوم کچھ اور کردیا ہے اور نہیں کہہ سکتے کہ آگے چل کر انسان کو جو معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ ان الفاظ کے کن معانی پر روشنی ڈالیں گی، بہرحال موجودہ زمانے کا انسان ان تینوں آیات کو بالکل اپنی جدید ترین معلومات کے مطابق پاتا ہے۔ (مولانا ابوالاعلیٰ مودودی: تفہیم القرآن)

آئیے دیکھیں کہ تخلیق کائنات یا کائنات کی ابتدا کے بارے میں وہ کون سے سائنسی نظریات ہیں جن کا حوالہ دینا مولانا آزاد نے مناسب نہیں سمجھا لیکن مولانا مودودی نے جدید ترین معلومات کے مطابق کہنے پر ہی اکتفا کیا، انہوں نے ان جدید معلومات کی مزید تشریح نہیں کی لیکن مولانا آزاد نے کائنات کی ابتدا کے سلسلے میں سورۂ یونس میں جو تشریحی نوٹ دیے ہیں، ہو بہ ہو جدید سائنسی نظریات خصوصاً کاسمولوجی اور ایسٹروفزکس کے بگ بینگ (اچانک بڑھا دھماکہ) سے مماثلت رکھتے ہیں، گرچہ مولانا نے ترجمان میں بعض آیتوں کی تشریح جدید انکشافات کی روشنی میں کی ہے، یہ سوال کہ کائنات کی تخلیق کیسے ہوئی ہے، یہ سوال ہزاروں سال سے سائنس دانوں کو پریشان کرتا رہا ہے، اس ہزارے میں آکر بگ بینگ نظریہ وجود میں آیا اس کے ساتھ ہی یہ بھی دریافت ہوئی کہ ہر چیز کی تخلیق ایٹم یا مادے سے ہوئی ہے اور اسی مادے کو تخلیق کی سب سے چھوٹی اکائی مانا گیا تھا لیکن جب خوردبین کے ذریعے ایٹم کو غور سے دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ ہر ایٹم کے مرکز میں پروٹران اور نیوٹران کے ذرے بھرے ہیں جس کے چاروں طرف الیکٹران چکر کاٹ رہے

ہیں، بعد میں پتا چلا کہ یہ پروٹران بھی بہت باریک کوارکس سے بنے ہیں، تاہم سائنس دانوں کو ان کے آپسی میل ملاپ اور مخالف حرکات کا کوئی سبب سمجھ میں نہیں آیا، ماہرین فلکیات نے ۷۰ کی دہائی میں بلیک ہول کا نظریہ پیش کیا، آئن اسٹائن کے بعد ایک نیا نظریہ جسے ایڈورڈ ووٹن اور ہاکنگ نے مل کر شہرت دی کے مطابق کائنات کی تخلیق کا خاص سبب وائلن جیسا ایک تار ہے جب اسے چھیڑا جاتا ہے تو اس میں سے ترنگیں نکلتی ہیں جو الگ الگ آواز پیدا کرتی ہیں، اگر ہر مادہ کی تخلیق کے پیچھے زنجیر نما اس تار کو سمجھا جائے تو ذروں کے آپسی تال میل کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے، اسے اسٹرنگ تھیوری کا نام دیا گیا، آگے چل کر سائنس دانوں نے دریافت کیا کہ جب یہ تار کسی ایک حالت میں ترنگیں پیدا کرتا ہے تو کوارکس بن جاتے ہیں اور جب یہ حالت بدل جاتی ہے تو یہ الیکٹران جیسا دکھائی دیتا ہے، یہ نظریہ جیومیٹری کے نظریہ پر قائم ہے اور جب اسے اچھی طرح سمجھ لیا جائے گا تو کائنات کی تخلیق کا واحد سبب دریافت ہو سکے گا، اس نظریہ کے اندر ایک Super Symmetary کا نظریہ بھی قائم کیا گیا، جس کے مطابق یہ دو ذرات کو آپس میں جوڑتی ہیں اور ان دونوں کے جڑنے کے سبب تیسرا ذرہ اپنے آپ پیدا ہو جاتا ہے لیکن ان ذروں کی سمت رفتار اور اس کی جگہ کا تعین یقین کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا ہے، صرف ارتعاش کی بہ دولت ہی اس کی حالت کا تعین کیا جا سکتا ہے، آج کے بہت سے سائنس داں کائنات اور وقت کے رشتوں پر گہرائی سے غور کر رہے ہیں، وہ کیونٹم فزکس اور آئنسٹائن کے نظریہ اضافت کو آپس میں ملا کر ایک یونا یفائڈ یا ملی جلی تھیوری دریافت کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

ادھر دوسری طرف حیاتیات کے میدان میں ڈارون کے نظریہ ارتقا کی مخالفت کرنے والے سائنس دانوں کا خیال ہے کہ زندہ متحرک عضویہ کا پیچیدہ نظام توافق اتنا حیرت ناک ہے کہ اس کی تشریح کسی صورت نہیں کی جا سکتی، ان کا کہنا ہے کہ یہ کام کسی بہت ذہین صانع یعنی خدا کا ہی ہو سکتا ہے، Behe جیسے سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ بین خلیاتی ترکیب کی ابتدا جو زندگی کی بنیاد مہیا کرتی ہے، اس کی تشریح صرف فطری انتخاب یا اتفاق پر مبنی کسی اور مشینی حرکت سے نہیں کی جا سکتی۔

ادھر کچھ کائناتی سائنس داں کائنات کی ابتدا ماورائی طاقت کو ماننے لگے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ دس سے بیس کھرب سال پہلے انرجی کے اچانک پھٹ جانے سے کسی ایک لمحے میں

یہ کائنات وجود میں آگئی لیکن کیسے؟ ایک مفکر سائنس داں وائن برگ کا کہنا ہے "اس زمانے میں آگ کے گولے کا درجہ حرارت اور 1,0000000000000000 (ایک کے آگے سولہ زیرو) رہا ہوتا، آج کی فزکس ہمیں بتاتی ہے کہ اس وقت اس آگ کے گولے میں جسے آج مادہ یا میٹر سمجھا جاتا ہے اس کے ساتھ ہی غیر مادہ یا اینٹی میٹر بھی رہا ہوگا، ذرے ایک دوسرے کی مخالف خصوصیات رکھنے والے تھے، یہی لمحہ تخلیق کا بھی تھا اور نیستی کا بھی کیوں کہ مادہ اور غیر مادہ دونوں ہوا کی پتلی لہر سے اٹھ رہے تھے اور اس میں تغیر پیدا ہو رہا تھا۔

اگر الیکٹران کے مقابلے غیر الیکٹران اور کوارک کے مقابلے غیر کوارک کا عنصر ذرا بھی بڑھ گیا ہوتا تو آج کی کائنات سے عمومی میٹر بالکل ختم ہو گیا ہوتا، اینٹی میٹر کے مقابلے میٹر کی اس زیادتی کی وجہ سے جو اندازاً 1,000000000 سے ایک حصہ زیادہ ہے، وہ بچ گیا جس کی وجہ سے تین منٹ بعد پروٹون بنے اور ان کے دس سال بعد ہائڈروجن اور ہیلیم وجود میں آئے، جن کی بہ دولت ستاروں میں کاربن اور آکسیجن پیدا ہوئے، مادے کی اس زیادتی کے بدلے ہی کائنات وجود میں آئی۔

بگ بینگ نظریہ کے ماننے والے کیونٹم میکنک کا سہارا لے کر اس کی وضاحت کرتے ہیں لیکن اس سے مسئلہ حل نہیں ہوتا کیوں کہ کیونٹم کے واقعات کے لیے شاہد کی ضرورت ہوتی ہے، ایک ریکارڈ کی جو وقوع پذیر واقعے کو ریکارڈ کر سکے کہ کس نے بگ بینگ کا مشاہدہ کیا، کس نے اس واقعے کے ہونے کو ریکارڈ کیا، لیکن جیسا کہ مولانا آزاد نے ہیولے کی تشریح دھوئیں سے کی ہے، دھوئیں کے لیے ضروری ہے کہ آگ کا وجود ہو یا ممکن ہے یہ ایتھر رہا ہو جو دھوئیں کی صورت میں رہا ہو لیکن یہ ایتھر تو اس کائنات کی چیز ہے، ممکن ہے دھواں آگ کی وجہ سے پیدا ہوا ہو، اس طرح گرمی اور دھوئیں کے تصور کی وجہ سے ہم بگ بینگ تھیوری کے نزدیک آجاتے ہیں لیکن یہاں یہ بھی یاد رکھنے کی چیز ہے کہ قرآن شریف سائنس کی کتاب نہیں، اس میں کہیں کہیں واضح اور کہیں مبہم اشارے ملتے ہیں جنھیں سمجھنے کے لیے اگر ہم جدید انکشافات یا نظریات کا سہارا لیں تو آسانی ہو جائے گی، جیسا کہ مولانا مودودی کا خیال ہے، اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن شریف میں آدم کی تخلیق کے سلسلے میں بھی مٹی کے پتلے میں جان پھونکنے کی بات کہی گئی ہے، کہیں یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ آدم کی تخلیق کے وقت مٹی کے پتلے میں دل و دماغ، گردہ، مثانہ، جگر اور خون بنایا گیا، پھر جان یا

روح پھونکی گئی لیکن ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ ہابیل اور قابیل کے جسموں میں یہ سارے اعضا تھے اور ہابیل کے قتل کے بعد اس کے جسم سے خون نکلا تھا، سورۂ حج میں انسان کی تخلیق کے سلسلے میں جو مدارج بیان کیے گئے ہیں انہیں مولانا آزاد موجودہ جنین (Genetis) کے خیال سے متفق پاتے ہیں۔

ادھر اسٹرنگ تھیوری کے ماننے والوں کا خیال ہے کہ اس کائنات کے ساتھ ایک دوسری کائنات بھی ہے جن میں کبھی کبھی تصادم بھی ہوتا رہتا ہے، جب یہ تصادم زیادہ بڑھ جائے گا یہ دنیا ختم ہوجائے گی (ٹائمس آف انڈیا، ۲۴/اگست ۲۰۰۵ء)، اس طرح سائنس بھی حتمی طور پر کائنات کی ابتدا کے بارے میں کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکی ہے، ہمارے لیے بہتر ہے کہ مشیت ایزدی کا سہارا لے کر اس کی تخلیق کا سبب سمجھیں۔

شبلی - حافظِ شیرازِ ہند

از:- پروفیسر عبدالحق ☆

آپ اسے میری ادعائیت پر محمول نہ فرمائیں، میں آپ کے استصواب پر یقین رکھتا ہوں، میرا معروضہ یہ ہے کہ علامہ شبلی اور علامہ اقبال نے ہماری عظمت وار جمندی میں جو اضافہ کیا ہے، وہ بے مثل و بے نظیر ہے، عالمی سطح پر ان کی وجہ سے ہماری توقیر میں گراں بہا اضافہ ہوا ہے، ان کی تحریروں نے ہمارے شعر و ادب کو آفاقی وسعتوں سے روشناس کیا ہے اور اپنے عہد و احساس کے تمام درد و داغ کو اعتبار بخشا ہے۔

یہ فیضان نظر کا ایک معجزہ ہے کہ استاد اپنے شاگرد کے دل و دماغ میں حلول کر جائے اور فکر و نظر کی تشکیل میں اپنے مشاہدہ و مزاج کو اس طرح منتقل کردے کہ شاگرد پیکر جمال ہم نشیں کہلائے، مولانا فاروق چریاکوٹی شبلی گر ہیں انہیں شبلی پر ناز تھا، ان کا قول "انا اسد وانت شبلی" ایک بڑی حقیقت کا اعتراف ہے، شیخ محمد اکرام شبلی کے ناقد ہیں، شبلی نامہ میں انہوں نے شبلی کے تعارف میں چند اشعار نقل کیے ہیں جن کا مفہوم ہے کہ میں نے اکثر رازی و غزالی کے افکار سے سیرابی حاصل کی ہے، شیراز کے نغمہ سراؤں سے ہم آواز رہا ہوں اور حجازی آہنگ کے اسرار بھی مجھ میں موجود ہیں، میں وہ قابل رشک گوہر فروزاں ہوں جس کا نور ہر بزم میں جلوہ ساماں ہے، شبلی اگر اشعار میں اپنا تعارف کراتے تو یہی کہتے، یہ اظہار علامہ شبلی کی نوع بہ نوع شخصیت پر صادق آتا ہے۔

علامہ شبلی ایک انسائیکلوپیڈیائی شخصیت کے امین ہیں، ان جیسی ہمہ گیر طبیعت اور متنوع جہات میں منفرد موضوع اور اسلوب کا مالک ان کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں، ادب و انشا پر ایسی گہری چھاپ ڈالنے والا بھی کوئی دوسرا نظر نہیں آتا، تاریخ و تمدن، فلسفہ و مذہب، سیرت و سوانح،

☆ پروفیسر ایمریٹس، دہلی یونی ورسٹی، نئی دہلی۔

شعر و ادب، نقد و انتقاد، عرفان و ادراک سے بہرہ مند، خروش احساس سے مالا مال، ملی حمیت و غیرت سے سرفراز، دور اندیشی و دور بینی کے ساتھ کارگہ فکر میں تقدیر کے ستاروں کی تخلیق کرنے والا شبلی اور صرف شبلی ہے، ان سب سے قطع نظر وہ اثر آفریں اسلوب کے سحر ساز صاحب طرز ادیب ہیں جس میں نثر و شعر کے کمال امتزاج کی دل کشی دامنِ دل کو منور کرتی ہے، عظیم تخلیق کاروں کی طرح شبلی کو بھی اپنی کیفیت اور شخصیت کی سربلندی کا احساس ہے۔

شبلی امروز بود ، بلبل بستان سخن
کہ از و گل کدۂ ہند پُر از صوت و نواست
بہ آب و رنگِ نظم خویشتن نازد چناں شبلی
کہ در اقلیم معنی کہنہ استاد است پنداری

کہا جاتا ہے کہ ہر بڑے فنکار کو اپنی بلندیوں کا احساس ہوتا ہے اور اسے قابلِ معافی سمجھا گیا ہے وہ اپنے شہ پاروں کا پارکھ ہوتا ہے اور ایک میزانِ قدر بھی متعین کرتا ہے۔

شبلی کے رفعتِ احساس کی ارجمندی دیکھیے کہ وہ اپنے کو ہندوستانیوں میں شمار نہیں کرتے کیوں کہ وہ اس لازوال اور عظیم ثقافتی میراث کے پاسبان ہیں جن کا سلسلۂ ارتقاع وسط ایشیا سے ملتا ہے جو عالمی ثقافت میں سب سے زیادہ نمایاں ہے، خود وہ بھی اپنے گفتار کی عظمت پر متحیر ہیں۔

در حیرتم کہ پاکی گفتار از کجاست
شبلی مگر ز مردم ہندوستاں نبود

غالب بھی اسی نسبت پر زندگی بھر فخر کرتے رہے، اقبال کو نسبت ابراہیمی پر ناز تھا، وہ آہنگ حجازی کی بانگ رحیل سے سرخوش و سرجوش رہے۔

اسے تفاخر کہیے یا تکاثر لیکن یہ حقیقت ہے کہ شبلی کو خودنگری و خود اعتمادی کے ساتھ بے پایاں بخشی ہوئی صلاحیتوں کا احساس ہے، اسی سبب قارئین سے ان کا اندازِ تخاطب جداگانہ ہے اور یہی ان کے اسلوب کو بلند آہنگی سے ہم کنار کرتا ہے۔

ایں کہ در ہر شیوۂ یکتا بودم
یا

صد حرف راز بود نہاں در نگاہ من

یہی سبب ہے کہ وہ کم مایہ اردو کو سرچشمۂ تخلیق کی ترجمانی کے لیے زیادہ موثر نہیں سمجھتے، سیرۃ النعمان کے دیباچہ میں لکھا ہے۔

گرچہ مرا شیوۂ فن ایں نبود
حرف بہ اردو زدن آئیں نہ بود

غالب نے بھی یہی سمجھا اور اردو کو بے رنگ کہہ کر فارسی بینی کا مطالبہ کیا، حد یہ ہے کہ اقبال جیسے پیغام بر شاعر بھی اگر خلوت میسر ہو تو پڑھ زبور عجم، کہہ کر اپنے قارئین سے کچھ اور توقع کرتے ہیں یا گیسوئے اردو کو منت پذیر شانہ ہی سمجھتے رہے، یہ زبان و بیان سے رجوع کرنے کی بات نہیں ہے بلکہ یہ ثقافتی سچائی ہے غالب و اقبال کی طرح شبلی کی فارسی شاعری اردو سے کہیں زیادہ وقیع ہے، انہیں کیا خبر تھی کہ یہی اردو دوامی شہرت دے گی، ثقافتی عظمت کا احساس کمال ان کے فن کو جلال و جبروت بخشتا ہے اور اسلوب بیان کو بہ قول ڈاکٹر سید عبداللہ صمیمیت اور صلابت سے ہم کنار کرتا ہے۔

علامہ شبلی کے اسلوب کی اساس ان کی تخلیقی فعالیت سے تاب کار ہے، وہ طبعاً نغمہ و نے سے بڑی نسبت اور قربت رکھتے ہیں، ان کی تحریر میں شعر و نغمے کی تجلیاں جا بجا بکھری پڑی ہیں اور ہمارے لیے نشاط انگیزی کے سامان فراہم کرتی ہیں، شعر کے صوری مفہوم سے قطع نظر شبلی کے نہاں خانہ تحریر کو دیکھیں اسلوب فکر کی ایک فضا میسر آئے گی۔

بزمِ شراب و شاہدِ رنگین و بانگ نے
ایں حرفے از فسانۂ عہدِ شباب بود

شبلی نے صرف شعر تخلیق نہیں کیے، اس کے پراسرار رمز کو بھی بتادیا جو تمام انتقادی مباحث پر غالب ہے اور یہ تنقیدی دبستانوں کی موشگافیوں کو قصر بے بنیاد قرار دیتا ہے، ان کی شخصیت کا یہ پہلو سب سے زیادہ قابلِ توجہ ہے، ان کی عظمت تخلیق تنقید کے ارتباط سے عبارت ہے، تنقیدی بصیرت میں شبلی کا کوئی حریف نہیں ہے، ان کے وضع کردہ اصولوں میں بڑی توانائی ہے جن کے اقرار کے بغیر چارہ نہیں اور یہ شبلی کے ادبی مزاج اور تخلیقی ہنر سے متعلق تصورات کو

سمجھنے میں چراغ راہ گزر اور مینارۂ دانش کا کام کرتے ہیں۔

شعر اگر دامن دل می نکشد بانگ خرست — نغمہ گر نیست دل آشوب بغوغا ماند
پائے ازیں دائرہ تنگ بروں نہ کہ سخن — خود محیطیست کہ ہر قطرہ بدریا ماند
جادۂ مغربیاں گیر کہ ایں طرز نوی — دل پذیرست و دل آویز و دل آرا ماند

شعر و ادب کا اتنا واضح اور آفاقی نقطۂ نظر شبلی کی تخلیقی بصیرتوں سے ہم آمیز ہے، شبلی کو مغرب بیزار کہنے میں کوئی کسر نہیں رکھی گئی، تائید یا تاویل میں دفتر بے معنی بھی وجود میں آیا، مگر شبلی کے تصورات کا تنوع دیکھئے کہ جادۂ مغربیاں کو ستائش کی نظر سے دیکھا ہی نہیں گیا بلکہ اسے اپنانے کی آرزو رکھتے ہیں، ان کی اس وسعت نگاہ اور قلب و نظر کی فراخی کے باوجود انھیں کوتاہ نظر کہنا حقیقت سے کتنا دور ہے ان پر اس طرح کے اور بھی اعتراضات عائد کئے گئے ہیں جن کی بنیادیں بہت بودی ہیں، ان کو روایت پرست اور ماضی پرست بھی کہا گیا اور بعض حلقوں نے باور کرانا چاہا کہ شبلی نے اردو میں غلط روایات کی بنیاد رکھ کر اجتہادی نقطۂ نظر اور روشن خیالی کو بہت نقصان پہنچایا، حالاں کہ شبلی کے مطالعہ سے ظاہر ہے کہ ان کی دانش وری جن بصیرتوں کی حامل ہے، وہاں تک بڑے ذہن کی نہ رسائی ہوسکی اور نہ ہی ان میں وہ ادراک پیدا ہوسکا جو ماضی وحال کے مشاہدے سے مستقبل پہچان لیتا ہے، شعر و ادب کی فکری روایت میں امروز و دوش کے جام جہاں نما میں فردا کی کیفیات کا ادراک شبلی و اقبال سے زیادہ کسی کو نہیں ہے، شبلی کا فکر واحساس ایک اعتدال اور توازن رکھتا ہے، وہ زود حس ہیں اور جذباتی بھی مگر یہ عناصر ان کی فکر ونظر پر غالب نہیں ہیں، وہ منطقی ہیں اور کلامی بھی، جن میں توازن اور تعدیل شرط اول ہے ان اشعار و افکار کو اس پس منظر میں دیکھنے اور شبلی کو دوبارہ دریافت کرنے کی ضرورت ہے۔

اس عہد کے فکری بحران کا مداوا بھی اس میں موجود اور مضمر تھا سرسید کے تلاطم کی سیرابی کا موجب بھی یہی نسخہ تھا جو بیاض مسیحا سے حاصل کیا گیا تھا، حالی کی زبان پر یہی وظیفۂ لب تھا۔

حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں

اس سیاق میں شبلی کی شہادت اس عہد کے فکری رویے کی سب سے معتبر شناخت بن کر ابھرتی ہے، جو سب سے جدا اور سب سے زیادہ موثرات کی حامل ہے، انہوں نے "جادۂ مغربیاں گیر"

کا مشورہ تو دیا مگر مغرب کی فسوں ساز ثقافت کی استعماریت کو جس تحقیر سے تخاطب کیا ہے، وہ حالی اور سرسید کے لئے جرأت آزمانہ بن سکی، مغرب کی جبروتی طاقت کے خلاف احتجاجی آواز کو بلند کرنے والے شبلی ہی اردو کے پہلے انقلابی شاعر ہیں۔

یہ مانا تجھ کو شکوہ ہے فلک کی خشک سالی کا
ہم اپنے خون سے سینچیں تمہاری کھیتیاں کب تک
یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک

ایسے ہی شبلی کی انتقادی عبقریت دیکھیے کہ ہندوستان میں مارکس کے ادبی نظریے کی صدائے بازگشت کی سرگوشی سے پہلے انہوں نے یہ تصور دیا تھا کہ خیال مادے سے پیدا ہوتا ہے۔

شعری اکتساب کے اقرار و اعتراف میں علامہ کے بیانات قابل ذکر ہیں، شیخ علی حزیں، صائب، نظیری اور حافظ شیرازی سے تخلیقی قرب کا اظہار محرکات شعری کی تفہیم میں بڑی معنویت رکھتا ہے اور یہ سلسلہ خاصا قدیم دکھائی دیتا ہے، مولانا فاروق چریاکوٹی اور مولانا فیض الحسن سہارن پوری کو شبلی گر کہنے میں تامل نہیں ہونا چاہیے، ذوق تخلیق کی تربیت اور تفاعل میں دونوں کا فیضان شامل ہے، ۱۸۸۷ء میں مولانا فیض الحسن صاحب کی رحلت پر مرثیے کے اشعار اس قلبی واردات کا پتا دیتے ہیں۔

بہرکش علم و فن در نالہ بامن ہم نوا باشد
ہنر برخویشتن ، گرید چومن بے خویشتن گریم
صبا گر بگذری بر تربتِ پاکش بگو ازمن
کہ ای در شیوۂ دانش مرا استاد و رہ برہم

۱۸۸۳ء کے فارسی خطوط میں بھی رزمیہ صائب کا ذکر ملتا ہے، (مکاتیب شبلی حصہ دوم، ۱۹۲۷ء، اڈیشن ص ۶۵۶) فارسی کلیات کے یہ اشعار بھی قابل توجہ ہیں۔

شبلیا کیست ؟ کز و دادِ سخن می خواہی
گر نظیری نبود شیخ حزیں می باید

ہماں کرد از سخن در ہند شبلی
کہ صائب در سواد اصفہاں کرد

ان بیانات سے قطع نظر شبلی کے مزاج کو خواجہ حافظ شیراز سے جوانس اور ہم آہنگی ہے وہ کسی سے نہیں، شبلی کی شخصیت کے خدوخال اور طبیعت کی گوناگوں کیفیات خواجہ حافظ کے احوال واحساس کے مماثل ہیں، دونوں میں مطابقت کے کئی پہلو مشترک ہیں، شبلی بھی اس ذہنی کیفیت کے اظہار میں فراخ دل ہیں اور ان کا یہ قول اردو اور فارسی ادب کے منظرنامے میں اقرارنامے کا درجہ رکھتا ہے۔

گر خداوندی ہوس داری در اقلیم سخن
بندگیٔ حافظِ شیراز می بائست کرد

یا ۱۹۸۲ء میں سفرِ شام سے واپسی پر ترکیب بند کا شعر۔

از سفر شبلیٔ آزادہ بہ کالج برسید
یا مگر بلبلِ شیراز بہ شیراز آمد

ان اقرار واعتراف کی کسی خوش فہمی میں پڑے بغیر کچھ حقائق پیش کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کو ہم خیال بنا سکوں کہ شبلی کی شاعری پر خواجہ حافظ کے اثرات سے زیادہ کوئی دوسرا حلقۂ اثر نمایاں نہیں، شبلی کے وہی مرشد معنوی ہیں اور اکتساب ہنر کے لیے آتشِ فروزاں بھی، یہ بات بھی ذہن میں رکھیے کہ شبلی نے اپنی مایۂ ناز تصنیف شعر العجم کے حصہ دوم میں بڑی وارفتگی کے ساتھ خواجہ صاحب کا تذکرہ کیا ہے، اس سے بھی ہمارے خیال کی توثیق ہوتی ہے۔

فارسی کلیات کا حجم بہت ہی مختصر ہے، یعنی کل ۱۲۰ صفحات دوسری طرف خواجہ حافظ کے اثر و نفوذ کی کثرت آرائی سے شبلی کی تشویق کا بھرپور احساس ہوتا ہے اور تخلیقی قربت کا مکمل ادراک بھی۔

دیوان حافظ کی تیسری غزل عالم گیر شہرت کی حامل ہے، اس میں رنگ و آہنگ کے ساتھ جذبہ واحساس کا ایک دل نشین امتزاج موجود ہے۔

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل ما را

بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

اس غزل کی مجموعی فضا اور اثر آفریں کیفیات کی دھوپ چھاؤں شبلی کی غزلوں میں کئی جگہ دکھائی دیتی ہے، جن سے ان کی پسندیدگی اور والہانہ قربت کی نشان دہی کی جاسکتی ہے، ہندی زلف ان کے تخلیقی محور میں نقطۂ ارتکاز کی حیثیت رکھتی ہے۔

ہندوی زلف تو چوں کفر فرشی بکند
ہندوی زلفش چرا دامن ہمی چیند زمن

فارسی غزلوں کی تخلیق کا محرک اول سواد بمبئی ہے، جس سے صرف نظر کر کے ان شہ پاروں سے لطف اندوزی مشکل ہے، خود ان کا قولِ فیصل ہے۔

شاعری از من مجو د راز سواد بمبئی

اس تیسری غزل کی ہم نشینی شبلی کے سبوچہ غزل میں اسی طرح جلوہ فرما ہے جیسے حافظ کے پیالے میں عکسِ رخِ یار۔ شبلی بہشت بریں کی بشارتوں کو چوپائی کے لبِ آب جو پر طلب کرتے ہیں اور نعمتِ کونین سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔

بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنت نخواہی یافت
کنار آب چوپائی و گل گشتِ اپالورا

شبلی کی اس غزل میں خواجہ حافظ کی سرمستی وسرشاری ایک دلآویز کیفیت برپا کرتی ہے، جوش انگیز اور طرب ناک تصویروں کے منظر لاحظہ فرمائیے۔

بہ ہر سو از ہجوم دلبران شوخ و بے پروا
گذشتن از سر رہ مشکل افتادست رہرو را

اس ہجوم دلبراں میں خواجہ نے شکایت کی تھی۔

دل می رود ز دستم صاحب دلاں خدارا

شبلی کا مصرع دیکھیں:

فرصت زدست می رود از دیر مے کشد

شبلی نسیم صبح بیا کہہ کر خواجہ کے صبا بلطف بگوئی یاد دلاتے ہیں، شبلی کا مصرعہ ملاحظہ ہو:

گفتگو از خم و مینا و سبو خواہد بود

اور خواجہ کو دیکھیے۔

تا ز میخانہ و مے نام و نشاں خواہد بود

حافظ کا مشہور مطلع

یوسف گم گشتہ باز آید بہ کنعاں غم مخور

شبلی کہتے ہیں۔

گوئیا یوسف گم گشتہ بہ کنعاں آمد

آمدِ بہار اور اس کی جنوں خیزی کا پرکشش اظہار حافظ کے یہاں اکثر و بیشتر ملتا ہے۔

بہار توبہ شکن میرسد چہ چارہ کنم

شبلی نے اس قلیل سرمایہ سخن میں بھی فصل بہار کے آتے آتے صبر و شکیب کے جاتے رہنے کا ذکر کثرت سے کیا ہے۔

شاہد و بادہ و طرف چمن و جوش بہار
شبلیا ! خود تو بفرما کہ بہ اینہا چہ کنم

یا

ساغرِ بادہ و طرف چمن لالہ رخے
چوں بہ اینہاں فتدم کار بفرما چہ کنم

خواجہ حافظ کے جمال آگیں دوست کے پیکر میں چہرۂ زیبا کو خاص اہمیت حاصل ہے، رخ ہمچو ماہِ تاباں کو قیامت خیز بتایا گیا ہے لب و رخسار کے ساتھ چشم سیاہ کی ان گنت کیفیات کا ذکر ان کی جمال دوستی یا حسن پرستی کی دلیل ہے، شبلی کے یہاں کم و بیش ان کیفیات سے لطف اندوزی حافظ کی طرح ایک صلائے عام کی پکار ہے۔

شبلی خراب کردۂ چشم خراب اوست
تو در گماں کہ مستیٔ او از شراب بود

شبلی کے یہاں ان پیکروں کی چند ترکیبیں اور تصویریں ملاحظہ فرمائیں:

چشم سرگیں، چشم سحر طراز، ترک چشمش، چشم لطف، نگاہ شوخ، چشم پرفن، نگہ شوق، نگہ ناتمام، چشم مست، چشم بادہ گسار، دیدۂ گستاخ، ان سے اندازہ ہوگا کہ شبلی کی جمالیات میں محبوب کے سراپا میں آنکھوں کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے، دل فروز جمال دوست کی ایک تصویر ملاحظہ ہو۔

آں قدر محو تماشائے جمالش بودم
کہ نگہ را خبر از لذت دیدار نماند

لذت دیدار اور نشاط وصل یار سے شبلی نے اپنے کلام کو جو رعنائی بخشی ہے وہ ہندوستاں کیا فارسی کے بہت سے فنکاروں کے یہاں مفقود ہے، شبلی کی فارسی شاعری میں والہانہ سرشاری اور وارفتگی کے ساتھ سپردگی اور شادکامی قاری کو جس طرح اپنی گرفت میں لیتی ہے وہ شبلی کے فن کی معجز نمائی ہے، محسوس ہوتا ہے کہ شبلی آئین ہم آغوشی کے سبھی آداب فراموش کر دیتے ہیں اور گہرے جذبات و لذت احساس کے فراواں احوال میں گم ہو جاتے ہیں، ان اشعار کی شوخی و شادابی کو شعر فارسی کے سیاق میں ندرت حاصل ہے۔

آغوش شوق و دیدۂ گستاخ و دستِ شوخ ۔۔۔ در وصل ہر چہ بود ز من خود بکار بود
از بسکہ تند بود مئے خوش گوار وصل ۔۔۔ مستی بدوں ز حوصلۂ اختیار بود
رسم و آئین ہم آغوشی نمی دانم کہ چیست ۔۔۔ دست گستاخ آنچہ فرمودہ است من آں کردہ ام
از شرم یار پُرس کہ در خلوتِ وصال ۔۔۔ مابودہ ایم و یار و کسے درمیاں نبود

ان حسین پیکروں کی تخلیق اور زندگی کی شادمانیوں سے قلب و نظر کو حاصل ہونے والی کیفیات کے اسباب و عوامل جو بھی ہوں ایک بدیہی حقیقت شیراز ہند کی وہ خاک ہے جو خوشبوؤں سے لبریز گلاب، بیلے اور یاسمین کے چمن در چمن پھول کھلاتی ہے اور حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے کو کنار کی کاشت اور ان کے پھولوں کی فراوانی سے پوری فضا میں نشہ و سرور کی تاثیر پیدا ہو جاتی ہے، غزل کی تخلیق آرائی کے لیے اس سے بہتر بیرونی فضا اور کیا ہو سکتی ہے؟ اس پرکیف منظر نامہ کو اگر ساحلِ سمندر اور سوادِ بمبئی کی فضا حاصل ہو تو غزل کی تحریک اور تاثیر بڑھ جائے گی، دوسری طرف یہاں کی مٹی سے حسین پیکروں کے مجسمے تراشے جاتے ہیں اور صنم کدے آباد ہوتے ہیں، شیراز ہند کے معبد ہوں یا مجسمے یا فنِ تعمیر کے شاہکار سب میں مقامی پتھروں کا استعمال عام ہے، جن میں

سنگ تراشی اور مجسمہ سازی کا فن عروج کمال پر نظر آتا ہے، یہ ہنر قریہ قریہ عام ہے، یہ مجسمے بہ ظاہر بے جان ہیں مگر دیدۂ بینا اور لذت احساس رکھنے والوں کے جسم و جان میں جذبات کا تلاطم پیدا کرتے ہیں، آخر شبلی کے ممدوح ایرانی شاعر شیخ علی حزیں کو ترک وطن کرنے اور بنارس میں سپرد خاک ہونے کی آرزو کے اسباب ہم سب کو معلوم ہیں۔

از بنارس نہ روم معبد عام است ایں جا

فارسی و اردو کا مایۂ ناز جمال دوست اور ایرانی و افراسیابی تہذیب پر ناز کرنے والا حسن پرست شاعر غالب جب اس زمین پر قدم رکھتا ہے تو مثنوی چراغ دیر کی تخلیق کرتا ہے، ایسی نشاط انگیز اور منظر آفریں مثنوی اردو کیا فارسی میں بھی مشکل سے ملے گی۔

ہمہ جاں ہائے بے تن کن تماشا ندارد آب و خاک ایں جلوہ حاشا
سوادش پایہ تختِ بت پرستاں سراپایش زیارت گاہِ مستاں
قیامت قامتاں مژگاں درازاں ز مژگاں برصف دل نیزہ بازاں
بیاباں در بیاباں لالہ زارش گلستاں در گلستاں نو بہارش

دارالخلافہ دہلی پر ناز کرنے والے شاعر غالب جب بنارس میں قدم رنجہ فرماتے ہیں تو سفر کی صعوبت اور پنشن کے حصول کے مقدمات سے کچھ بے نیاز ہو جاتے ہیں، حالاں کہ اس کے لیے انہوں نے سو سو جتن کیے ہیں، بنارس میں تقریباً ایک ماہ کا قیام ایک عجوبہ بھی ہے اور اسباب قیام پر غور و فکر کا تقاضا بھی کرتا ہے، الہ آباد میں چند دن ٹھہرے اور شہر کی مذمت کی لیکن بنارس نے ان کا دل موہ لیا قیاس کہتا ہے کہ اگر کلکتہ کا سفر درپیش نہ ہوتا تو شاید اسی سرزمین پر قیام ہوتا اور دہلی کو خیر باد کہتے۔

مہدی افادی کی رومانی نثر ریاض آبادی کی خمریہ شاعری، اصغر گونڈوی کی عارفانہ غزلیں، لمس احساس سے معمور فراق کا فن، احساس کی لطافت اور زندگی کی سرشاریوں سے لبریز رشید احمد صدیقی کی تحریریں، مجروح کی پرکیف غزلیں سب اسی زمین کی دین ہیں، انہیں رعایتوں اور نسبتوں سے اسے شیراز ہند کہا گیا، یہاں حافظ شیرازی کے بارے میں مطالعہ و مشاہدہ یا علم و عرفان کا رجحان عام رہا ہے، معاصر ماخذ کا انمول حوالہ اور دیوان حافظ کے قدیم ترین نسخہ نذیر و جلال نینی کی دریافت اسی زمین کی سنبھالی ہوئی وہ بیش بہا امانت ہے جسے چار دانگ عالم میں شرف و سعادت حاصل ہے،

خانقاہ رشیدیہ کے اس نایاب نسخے کو جون پور سے ہی نسبت ہے، بہ قول علامہ اقبال۔

چشم مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خذف ریزہ درناب

علامہ شبلی کی غزل گوئی کہ روایت کی ایک معتبر توسیعی صورت مولانا گرامی اور علامہ اقبال کی غزل گوئی ہے، خاص طور پر "زبور عجم" کی غزل کے حوالے سے ناچیز بڑے اعتماد سے کہہ سکتا ہے، انہیں دونوں بزرگوں کی فارسی غزل گوئی ہمارے لازوال تخلیقی تسلسل کی معراج ہے اور منہاج بھی۔

حریفاں بادہا خوردند و رفتند

تخلیقی سطح پر شبلی کے مزاج کو غزل سے جو مناسبت ہے، وہ دوسرے اصناف سے نہیں ہے، اس کے برعکس اردو شاعری میں نظم نگاری سے انہیں خاص دل بستگی ہے، تاریخی واقعات کو نظم کرنے میں انہیں اولیت حاصل ہے، ساتھ ہی عصری حادثات پر بھی وہ آگہی اور عرفان سے بھرپور نظموں کی تخلیق کے موجد ہیں، اس اعتراف سے اعراض برتنے میں ہم نے بڑی ناانصافی کی ہے، ترقی پسندی کے زعم میں ان حقائق کا کتمان کذب و ریا سے کم نہیں ہے، جس کے ارتکاب جرم میں موجودہ ادبی تاریخ کے مرتبین اور ناقدین ملوث ہیں، فارسی میں بھی ان کی نظمیں ان کے نشاط کار کی نشان دہی کرتی ہیں، حیرت ہے کہ نظم نگاری سے اس گہری نسبت کے باوجود انہیں غزل سے ہی خاص شغف اور سروکار ہے، غزل کے جس بیان نے ان کی نثر کو انمول تخلیقی نمود سے نکھارا ہے، یہ کیف و کم کے ساتھ ان کی بیشتر تحریروں میں غزل کے اسلوب کی دل کشی رکھتی ہے، نثر کی یہی نے نوازی شبلی کو زندگیٔ جاوداں عطا کرتی ہے، ان کی نثر سرود سحر آفریں بن کر بیسویں صدی کے سرمایۂ نثر کو متاثر کرتی رہی ہے، شعری اسالیب کی تقلید کی بہت سی مثالیں موجود ہیں لیکن نثری پیرائیہ بیان کی پیروی کے لیے شبلی کو ہی مقتدر منہاج قرار دیا گیا ہے۔

ان کا کسب و کمال وہبی بھی ہے اور وجدانی بھی، شبلی کے جملوں اور عبارتوں میں تخلیقی الہام کی صورتیں ہمیں استعجاب میں مبتلا کرتی ہیں، سچ پوچھیے تو نثر کی نمود و نہاد دونوں غزل کے سرمایہ و ثروت سے گراں بہا ہیں، غزل سخن وری کی ہی نہیں تکلم اور تحریر کے لیے بھی برومندی کا جواز رکھتی ہے، شبلی کی غزل سے گرویدگی بے سبب نہیں ہے، وہ اس امر سے واقف تھے کہ مرحلہ ہائے ہنر کو غزل کے بغیر طے کرنا اندیشہ و افسوں سے کم نہیں۔

٭٭٭٭

قاضی نور اللہ شوشتری اور ان کی کتاب
"مجالس المومنین" کا اجمالی جائزہ

از:- علاء الدین خاں اصلاحی ☆

ہندوستان کے مسلم دور حکومت میں عام مسلمانوں کی سیاسی، مذہبی اور روحانی زندگی کی نشو و نما سلاطین، علما اور صوفیائے کرام کے زیر سایہ ہوئی، مسلمان بادشاہوں کی بہ دولت ہندوستان میں علما اور صوفیا کو قدم جمانے کا اور اسلامی تعلیمات کو فروغ دینے کا موقع ملا، مغلیہ عہد میں شیراز، کاشان، تبریز، گیلان، مشہد اور ترکستان سے جو علما آئے ان کی وجہ سے یہاں حنفی فقہ کی ترویج ہوئی اور اکثریت حنفی فقہ کے ماننے والوں کی رہی اور یہ مغلوں کی بادشاہت کا دل چسپ پہلو ہے کہ وزارت کے عہدہ پر زیادہ تر شیعہ امرا مامور رہے لیکن سلطنت پر حنفی فقہ کا غلبہ رہا جو مغل فرماں رواؤں کی دور اندیشی اور رواداری کا ثبوت ہے، عرصے تک ہندوستان کے علما کا سب سے پسندیدہ موضوع فقہ، خلاف رہا ہے کیوں کہ باہر سے آنے والے علما مفسر و محدث کے بجائے عموماً فقیہ ہی تھے جن کو سلاطین اور امرا کا تقرب آسانی سے حاصل ہو جاتا تھا، اس کی بہت ساری مثالیں ہیں، انہیں میں سے ایک مثال قاضی نور اللہ شوشتری کی بھی ہے، وہ فقہ اور حدیث میں مہارت رکھتے تھے اور اپنی صلاحیت کی بنیاد پر ہی اکبر کے دربار میں پہنچے۔

قاضی نور اللہ شوشتری ۴۲-۱۵۴۳ء میں شوشتر میں پیدا ہوئے (۱) لیکن مولف نجوم السماء وغیرہ کے مطابق ان کی ولادت ۱۵۴۹ء میں ہوئی (۲)، ابتدائی تعلیم شوشتر میں اپنے والد ماجد سید شریف الدین نیز دوسرے علما سے حاصل کی اور فقہ، اصول فقہ اور علم کلام کا درس بھی اپنے والد ہی سے لیا، عہد جوانی میں حصول تعلیم کے لیے مشہد بھی گئے اور وہاں کے مشہور عالم دین و

☆ لکچرر شعبۂ تاریخ شبلی نیشنل کالج، اعظم گڈھ۔

محقق المولی عبد الواحد تستری سے استفادہ کیا (۳)، قاضی نور اللہ شوشتری اپنے خانوادے میں تنہا صاحب فضائل و معارف نہ تھے بلکہ ان کے آبا و اجداد بھی صاحب فضائل و معارف تھے، ان کے والد سید شریف حسینی شیخ ابراہیم قطیفی کے شاگردوں میں بڑے پایہ کے فاضل تھے (۴) اور ان کے جد محترم سید نور اللہ ارباب تصنیف علما میں سے تھے، اپنی مشہور کتاب "مجالس المومنین" میں انہوں نے اپنے اجداد کے حالات قلم بند کیے ہیں، قاضی صاحب خود فرقۂ امامیہ کے اکابر مجتہدین کرام اور مشاہیر متکلمین میں تھے، انہوں نے اپنے اجداد طاہرین کی سچی پیروی کی اور انہیں کی طرح جام شہادت بھی نوش کیا (۵)۔

مشہد سے تحصیل علم کے بعد ۱۵۸۴ء میں وہ وارد ہند ہوئے (۶)، سب سے پہلے حکیم ابو الفتح گیلانی سے ملاقات ہوئی اور انہیں کے یہاں قیام فرمایا، اس وقت دربار اکبری میں بڑے بڑے علما و فضلا کا مجمع تھا، حکیم ابو الفتح گیلانی کو ان میں اہمیت حاصل تھی، انہوں نے نور اللہ کے فضل و کمال کا تذکرہ اکبر سے کیا، اس طرح وہ حکیم صاحب کے توسط سے دربار میں پہنچے، بادشاہ کے دل پر ان کے کمال کا سکہ بیٹھ چکا تھا، اس نے صف اول کے علمائے دربار میں ان کو جگہ دی (۷) اس زمانے میں لاہور کے عہدہ قضا پر شیخ معین الدین کام کر رہے تھے، پیرانہ سالی کے باعث ان کے قوی جواب دے چکے تھے اور اکبر نے ان کی جگہ پر ۲۷ مئی ۱۵۸۵ء کو نور اللہ شوشتری کا بہ حیثیت قاضی تقرر کر دیا (۸)، قاضی نور اللہ شوشتری ایک متبحر عالم تھے، سنی مسلمانوں کے مشہور مذاہب اربعہ کی فقہ میں دست گاہ رکھتے تھے، لہذا جس وقت ان کو عہدہ قضا تفویض ہوا تو انہوں نے یہ کہا کہ میں کسی ایک مذہب کا پابند نہیں ہو سکتا ہاں ان چاروں مسلک میں سے جو مسلک میرے ذاتی اجتہاد کے موافق ہوگا، اسی کے مطابق فتویٰ دوں گا، بادشاہ نے قاضی صاحب کی درخواست قبول کر لی (۹)، قاضی صاحب نے اپنے عہد میں ہمیشہ شیعہ امامیہ فقہ کے مطابق فتویٰ دیا اور اگر کسی کو اس پر اعتراض ہوا تو انہوں نے فوراً یہ جواب دیا کہ یہ فتویٰ چاروں مسلک میں سے فلاں مسلک کے موافق ہے، اس بنا پر ان کے بعض فتاویٰ حنفی، بعض مالکی، بعض شافعی اور بعض حنبلی فقہ کے مطابق ہوتے تھے، اس لیے یہ کہا گیا کہ قاضی صاحب نے بہ طور تقیہ شیعہ مسلک کی اشاعت و توسیع کا کام کیا اور خفیہ طور پر تصانیف کلامیہ میں مشغول رہے (۱۰)۔

۱۶۰۵ء میں اکبر کی وفات ہوئی اور جہاں گیر بادشاہ بنا تو قاضی نوراللہ بہ دستور اپنے عہدے پر فائز رہے، ان کے بعض مخالف علما کو جب اس کا پتہ چلا کہ وہ شیعی المذہب ہیں تو انہوں نے بادشاہ سے شکایت کی کہ قاضی نوراللہ شیعی مذہب کو مانتے ہیں اور سنی فقہ کے چاروں مذاہب میں سے کسی ایک مذہب کے پابند نہیں اور اس لیے ہر مسئلہ کا فتویٰ اس سنی فقہی مذہب کے مطابق دیتے ہیں جو فرقۂ امامیہ کے مذہب کے مطابق ہوتا ہے، ابتدا میں جہاں گیر نے ان باتوں کی طرف توجہ نہیں دی اور جواب دیا کہ اس سے ان کا شیعی مذہب ہونا ثابت نہیں ہوتا اور انہوں نے شروع دن سے ہی یہ شرط رکھی تھی کہ مذاہب اربعہ میں سے جسے وہ زیادہ مناسب سمجھیں گے، اس کے مطابق فتویٰ دیں گے (۱۱)، قاضی صاحب کے مخالف اس وقت تو ناکام رہے لیکن اس کوشش میں لگ گئے کہ ان کا شیعہ ہونا ثابت کردیں اور ان کے قتل کا حکم حاصل کرلیں، چنانچہ ان لوگوں نے ایک شخص کو قاضی صاحب کے پاس اس غرض سے بھیجا کہ وہ اپنے آپ کو شیعہ ظاہر کرکے ان کو اپنے اعتماد میں لے لے، وہ ایک مدت تک قاضی کے حلقۂ تلامذہ میں رہا، رفتہ رفتہ اتنا اعتبار پیدا کیا کہ قاضی صاحب کو اس پر اعتماد ہوگیا، یہاں تک کہ اسے کتاب "مجالس المومنین" کے متعلق اطلاع ملی، اس نے یہ کتاب قاضی صاحب سے مستعار لی اور اس کی ایک نقل تیار کرکے علما کے حوالے کردی، انہوں نے کتاب قاضی صاحب کی شیعیت ثابت کرنے کے لیے بادشاہ کے حضور میں پیش کی اور کہا کہ اس رافضی نے ایسی کتاب لکھی ہے کہ وہ سزا کا مستحق ہے، اس پر حد جاری کی جائے، بادشاہ نے پوچھا کہ کیا سزا ہونی چاہیے؟ علما نے کہا کہ درۂ خاردار لگایا جائے، بادشاہ نے اجازت دے دی، ان پر درۂ خاردار چلائے گئے اور آگرہ میں ۱۶۱۰ء میں شہید ہوگئے (۱۲)۔

جہاں گیر نے قاضی نوراللہ شوشتری جیسے شیعہ عالم کو غصہ میں اس لیے قتل کرادیا کہ ان کی بعض باتوں سے اس کے مذہبی احساسات کو ٹھیس لگی لیکن ان کی موت شیعوں کے لیے ایک بڑا الم ناک حادثہ ہے جس کا دکھ ان کو اب تک ہے، شیعہ اصحاب انہیں شہید ثالث کا درجہ دیتے ہیں اور ان کے مقبرے کی زیارت بڑی عقیدت سے کرتے ہیں، ایک روایت یہ ہے کہ قاضی صاحب کو عہد اکبری میں سنی سمجھا جاتا تھا جو صحیح نہیں ہے، جاننے والے ان کے عقیدے سے بے خبر نہ

تھے، اکبر سے بھی ان کا مذہب پوشیدہ نہ تھا، ارکان دولت بھی بہ خوبی ان کے مذہب سے واقف تھے لیکن اکبر کے نزدیک شیعہ سنی اختلافات کی اہمیت نہ تھی، دوسرے قاضی صاحب کا علم وفضل، منصف مزاجی اور مستعدی اتنے اعلا درجے کی تھی کہ مخالفین بھی ان کا احترام کرتے تھے، قاضی صاحب کا مذہب کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔

معاصر سنی مورخ عبدالقادر بدایونی بھی متشدد تھے، دربار اکبری کا کوئی شخص ان کی گرفت اور نوک قلم سے نہیں بچا، اس نے متانت وسنجیدگی کو نظرانداز کرکے بہت سے شیعہ علما کو ہدف بنایا ہے مگر وہ قاضی نوراللہ شوشتری کا ذکر بڑے احترام سے کرتا ہے، چنانچہ لکھتا ہے کہ:

"قاضی نوراللہ شوشتری اگرچہ شیعی مذہب کے تھے مگر انصاف اور نیک نفسی اور حیا وتقویٰ جیسی تمام صفات ان کی ذات میں جمع تھیں، علم وحلم اور ذہانت وذکاوت میں مشہور تھے، ان کی بہت سی کتابیں ہیں، شیخ فیضی کی بے نقط تفسیر پر انہوں نے ایک تقریظ نہایت عمدہ لکھی تھی، شاعر بھی تھے اور ان کے شعر نہایت دل نشین ہوتے تھے، اکبر کے عہد میں قاضی مقرر ہوئے اور فی الواقع لاہور کے مفتیوں اور محتسبوں کو انہوں نے خوب ٹھیک کیا اور رشوت کا دروازہ بالکل بند کردیا" (۱۳)۔

ان خوبیوں کے باوجود جہاں گیر ان سے ایسا بدظن ہوا کہ اپنے بعض شیعی امرا کا خیال کیے بغیر ان کا قتل کرادیا، اس نے غالباً شرمندگی کی وجہ سے اس حادثہ کا ذکر اپنی تزک میں نہیں کیا ہے۔

ملا عبدالقادر کے بیان سے ظاہر ہے کہ ان کا تشیع اس عہد میں پوشیدہ نہ تھا، مخالف و موافق سب اس سے واقف تھے، ان کے بیان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ قاضی شوشتری سے پہلے لاہور میں قاضیوں اور محتسبوں کے یہاں رشوت عام تھی۔

قاضی صاحب کے بارے میں بعض اہل علم کا خیال ہے کہ ان پر تصوف کا اثر تھا اور یہ حقیقت ان لوگوں پر پوری طرح عیاں ہے، جنہوں نے ان کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اور ان کے ملفوظات سے واقف ہیں کہ سید نوراللہ نے اپنی کتاب مجالس المومنین وغیرہ میں جماعت صوفیہ کی مدح کی ہے، جس میں حسین بن منصور حلاج وغیرہ شامل ہیں اور اسی طرح انہوں نے

سفیان ثوری، بایزید بسطامی، محی الدین ابن عربی اور ان جیسے دیگر صوفیائے متقدمین و متاخرین کی مدح کی ہے جن کے مذہب اور عقیدے کی خرابی امامی علما کے نزدیک ثابت ہے مگر مجرد ان صوفیا کی تعریف کر دینے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قاضی صاحب بھی تصوف کے قائل اور اپنے ممدوح کے مسلک کے گرویدہ تھے، کیوں کہ انہوں نے اپنی کتابوں میں بزرگ امامی علما ابن بابویہ اور مفید اور دیگر ان اہم علما کی مدح میں بھی رطب اللسان ہیں جنہوں نے صوفیا کی قدح اور ان کے مسلک پر تنقید اور ان سے اپنی برأت کا اظہار کیا ہے بلکہ اس سے خود ان کی صوفیا کی جماعت اور ان کے نظریات سے برأت کا پتہ چلتا ہے (۱۵)، اس حقیقت پر مزید دلالت ان کی کتاب احقاق الحق سے ہوتی ہے کیوں کہ یہ کتاب توحید، اللہ کی ذات وصفات، معرفت، نبوت وامامت اور معاد وغیرہ جیسے مباحث پر مشتمل ہے اور اس سے کہیں یہ پتا نہیں چلتا کہ ان کے اور اہل تصوف کے اقوال و خیالات میں ہم آہنگی ہے اور وہ علمائے امامیہ کے اصولوں کے مخالف ہیں (۱۶)، مثلاً صوفیا کے نظریہ وحدت الوجود وغیرہ کا فرقۂ امامیہ نے ابطال کیا ہے، قاضی صاحب نے بھی امامیہ علما کے اس نقطہ نظر اور ان کے دوسرے ثابت شدہ عقاید کا مدلل اثبات کیا ہے اور یہ بات تصوف کے منافی ہے (۱۷)، تصوف کے بارے میں قاضی صاحب کا مسلک لکھنؤ کے شیعہ علما سے بالکل مختلف تھا، علامہ مجلسی نے اپنے ایک رسالے میں جو باتیں تصوف کے متعلق لکھی ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیعوں میں بھی ایسے صاحبان عرفان ومنازل گزرے ہیں جو اپنے زہد وورع کی وجہ سے مشہور ہوئے ہیں اور کاملین شیعہ میں یہ اثر موجود ہوتا ہے، علامہ نے اسی رسالے میں یہ بھی کہا ہے کہ مطلق تصوف کا انکار بے بصیرتی کی وجہ سے ہوتا ہے۔

قاضی صاحب کی متعدد تصانیف ہیں، ان میں احقاق الحق اور مجالس المومنین کو اہم مقام حاصل ہے، احقاق الحق میں حکمت اشاعرہ کا ذکر ہے، مورخین کے نزدیک قاضی صاحب کا اصل شاہکار مجالس المومنین ہے، یہ کتاب شیعہ زعما کا ایک مبسوط تذکرہ ہے اور شیعہ مذہب کی تاریخ میں اس کا ایک خاص مرتبہ ہے، قاضی صاحب چوں کہ اثنا عشری تھے، اسی مناسبت سے انہوں نے اس کتاب کی مجالس کی تعداد بارہ رکھی ہے اور ہر مجلس میں ایک خاص طبقے کے شیعہ اکابر کا ذکر کیا ہے۔

کتاب کی ابتدا میں قاضی صاحب حمد وثنا کے بعد لکھتے ہیں کہ ”حضرت امیر المومنین کی خلافت کے زمانے سے لے کر سلاطین صفویہ کے ظہور سلطنت تک اہل تشیع میں تقیہ کا ایسا زور رہا کہ اپنے مذہب کو بالکل ظاہر نہیں کر سکتے تھے اور اپنے کو شافعی یا حنفی ظاہر کرتے تھے، اس سبب سے اپنے اکابر کے حالات نہ لکھ سکے“ (۱۸)، اس میں ان امنگوں اور حوصلوں کا پر جوش اظہار ہے جو شیعہ صفوی حکومت کے قیام سے شیعوں میں پیدا ہوئے، قاضی صاحب کے لفظوں میں تصنیف کتاب کی بنیاد ہی اس بات پر رکھی گئی ہے کہ صفوی حکومت کی پشت پناہی کی وجہ سے اب تقیہ کی ضرورت نہیں رہی بلکہ برملا میدان میں آنا چاہیے، قاضی صاحب نے استخارہ کرنے اور حضرت امیر المومنین سے فیض و مدد حاصل کرنے کے بعد اس کتاب کے مرتب کرنے کا عزم بالجزم کیا اور کتاب کا نام مجالس المومنین رکھا (۱۹)، اس میں جو طبقے شامل کیے گئے وہ شوشتری صاحب کے اپنے الفاظ میں یہ ہیں:

”بعض از مشاہیر شیعہ و مجتہدین شریعت وصحابۂ مرضیہ و تابعان طریقۂ مرتضویہ از مجتہدان احکام و راویان احادیث سید الانام وحکمائے اسلام وعظمائے ائمہ کلام وسائر علمائے اعلام وصوفیۂ کرامت مقام وسلاطین صاحب اقتدار وزرائے مملکت مدار وامرائے عظام و شعرائے فصیح الکلام“ (۲۰)۔

مجلس اول: اس مجلس میں مسلم ممالک کے نام، تاریخ، تعریف، آب وہوا اور وہاں کی پیداوار نیز باشندوں کے مذاہب کا ذکر کیا ہے، خصوصاً ان مقامات کا ذکر کیا ہے جن مقامات کو ائمہ طاہرین یا ان کے شیعوں کے ساتھ خصوصیت حاصل ہے، کچھ مقامات کا مختصر جائزہ لینے کی کوشش اس مضمون میں کی جا رہی ہے۔

بیت اللہ (کعبہ): سید حمیری کے حوالے سے بیت اللہ کا ذکر کرتے ہوئے قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ ”حضرت امیر علیہ السلام کی ولادت خانہ کعبہ میں ہوئی اور کوئی عالم میں ان کا ہمسر و نظیر نہیں ہے، دایہ نے کسی بچے کو کپڑے میں نہیں لپیٹا جو مثل علی کے ہو سوائے جناب محمد مصطفیٰ کے اور اسی فضیلت کی بنا پر بعض صاحبان دل نے حضرت کی ولادت کو وجوب طواف کعبہ قرار دیا ہے“۔

طواف خانۂ کعبہ ازاں شد بر ہمہ واجب
که آں جادر وجود آمد علی ابن ابی طالب (۲۱)

بیت اللہ کی ایک خصوصیت حضرت کے ساتھ یہ ہے کہ اسی خانہ کعبہ میں آپ نے جناب رسول مختار کے دوش اقدس پر قدم رکھ کر بتوں کو توڑا (۲۲) جناب رسول کے دوش اقدس پر قدم رکھ کر بتوں کے توڑنے کا جو واقعہ قاضی صاحب نے مجالس المومنین میں لکھا ہے، اس سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حضرت علی کی قدر ومنزلت بہت زیادہ تھی اور اس سے اشارہ تھا کہ حضرت علی ہی پیغمبر خدا ﷺ کے بوجھ اٹھانے میں شریک ہیں اور اس کے علاوہ اس میں بہت سی حکمتیں ہیں جن کو انسان شمار نہیں کرسکتا (۲۳)۔

مدینہ طیبہ: پہلے اس کا نام یثرب تھا پھر پیغمبر ﷺ نے اس کا نام مدینہ رکھا عجائب البلدان کے حوالے سے قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ ''جو مسافر وہاں وارد ہوا اسے ایک خوشبو محسوس ہوتی ہے اور عطر کی خوشبو اس شہر میں بہ نسبت دوسرے شہروں کے بڑھ جاتی ہے'' (۲۴) مدینہ کی خصوصیت، تاریخ اور اس کی آب وہوا کا ذکر کرنے کے بعد قاضی صاحب رقم طراز ہیں:

''مخفی نہ رہے کہ مدینہ کے اصل باشندے خواہ وہ سادات ہوں یا غیر سادات، ہمیشہ مذہب امامیہ کے پابند رہے ہیں ہاں وہ لوگ کہ جو دوسرے شہروں سے آکر مدینہ میں رہ گئے ہیں ان کا مذہب البتہ امامیہ کے خلاف بھی ہے'' (۲۵)

فاضل طبرسی کی کتاب تحفۃ الابرار کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''روئے زمین پر دو شہر ایسے گزرے ہیں کہ جہاں وحی نازل ہوتی رہی ہے اور جہاں حضور ﷺ کا قیام رہا ہے اور ان دونوں مقاموں کے اصل رہنے والے سب کے سب شیعہ ہیں'' (۲۶)۔

کوفہ: کوفہ کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ ''یہ اسلام کے بڑے شہروں میں سے ہے اہل کوفہ زیادہ تر شیعہ تھے اور زیاد بن ابیہ کو معاویہ نے کوفہ اور بصرہ کا حاکم اس لے بنایا کہ وہ وہاں کے لوگوں کو پہچانتا تھا اس نے شیعوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کرنا شروع کیا تاکہ کوئی شیعہ باقی نہ رہ جائے (۲۷)۔

مشہد نجف: قاضی صاحب مشہد نجف کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''نجف اشرف بھی ہمیشہ شیعان امامیہ کا مسکن وماویٰ اور صلحا واتقیا کا وطن رہا ہے اور وہاں کے رہنے والے سب کے سب شیعہ ہیں'' (۲۸)۔

جزائر خوزستان: اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس میں تین سو ساٹھ مواضع تھے جن کے دار الحکومت کا نام مدینہ تھا یہاں کی نمایاں پیداوار کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ ان مقامات کے سب رہنے والے مذہب شیعہ کے پیرو تھے، مالی لحاظ سے ایسے خوش حال کہ زکوۃ لینے والا ان کے ملک میں نہیں ملتا، احکام شرعیہ کے تابع ہیں، پھر بھی خوں ریزی سے باز نہیں آتے اکثر اوقات آپس میں جنگ ہوا کرتی ہے اور بہت سے لوگ قتل ہوجایا کرتے ہیں (۲۹)۔

غدیر خم، فدک، بلدۂ قم، شوشتر وغیرہ جیسے مشہور اماکن کا قدرے تفصیل سے ذکر کیا ہے اور ان شہروں میں رونما ہونے والے واقعات، یہاں کی خصوصیات نیز یہاں کے ساکنین کے مذاہب ونظریات پر سیر حاصل بحث کی ہے بلدۂ قم کے ذکر میں رقم طراز ہیں:

''یہ ایک بہت بڑا شہر ہے اور بہت سے اکابر مجتہدین شیعہ اہل قم سے تھے'' (۳۰) ''حضرت امام رضا نے فرمایا کہ جس نے اس کی زیارت کی اس کے لئے جنت ہے جنت کے آٹھ دروازے ہیں جن میں سے تین اہل قم کی طرف ہیں'' (۳۱)

قاضی صاحب نے جہاں دیگر ممالک کے اہم شہروں کا خاص طور سے ذکر کیا ہے وہیں انہوں نے ہندوستانی شہروں میں کشمیر وتبت کا ضمناً ذکر کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ یہاں بھی زیادہ تر شیعہ عقائد کے لوگ تھے۔

کشمیر: کشمیر کے حدود اربعہ، مقامات وسبزہ زار، اشجار واثمار کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کی آب وہوا کی خوبی اس سے ظاہر ہے کہ یہاں کے لوگ نہایت حسین وخوبصورت ہوتے ہیں ان کی خوبصورتی ضرب المثل ہے (۳۲) جہاں قاضی صاحب نے دیگر ممالک اسلامیہ کے حالات قلم بند کرنے کے لئے دوسری کتابوں کا سہارا لیا ہے اور روایات کا ذکر کیا ہے وہاں کشمیر کے ذکر میں وہ کہتے ہیں کہ اہل کشمیر کے مذہب کے حالات مجھے کسی کتاب سے نہیں معلوم ہوئے بلکہ میں نے خود کشمیر کا سفر کیا اور تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ یہاں کے رہنے والے نومسلم ہیں اور اب تک بہت سے باشندے کافر بھی ہیں اور جب سے سید علی ہمدانی نے یہاں رہنا شروع کیا تب ہی سے لوگ شیعہ ہونے لگے، ان کے بعد میر شمس عراقی کے جو شاہ قاسم نور بخش کے خلفا میں سے تھے کشمیر میں آنے سے مذہب شیعہ کا رواج ہوا (۳۳) اکثر فوجی لوگ شیعہ ہیں محلہ حسن آباد ومحلہ رونیل کے رہنے والے

شیعہ ہیں قصبہ شہاب الدین پور کے لوگ شیعہ فدائی ہیں یہاں کے پرگنوں میں پرگنہ بسو ہے، جس میں دو سو گاؤں ہیں یہ سب کے سب شیعہ ہیں (۳۴) غرض کہ کشمیر میں قاضی محترم کے مطابق زیادہ تر شیعہ تھے۔

تبت: تبت کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ جب میر شمس یہاں پہنچے تو اس کے باشندے مسلمان ہوگئے اور سب مذہب شیعہ اثنا عشری کے پیرو ہوئے اور یہ تشیع میں اس قدر مضبوط ہیں کہ اگر کشمیری سنیوں میں سے کوئی وہاں پہنچ جاتا ہے تو اس سے جزیہ لیتے ہیں اور باوجود اس کے کہ سلطنت ہندوستان کے جوار میں واقع ہیں، خطبہ میں ایران کے بادشاہ کا نام لیتے ہیں (۳۵)۔

قاضی صاحب نے مسلم ممالک اور جن اہم شہروں کا ذکر کیا ہے اسے کسی نہ کسی طرح شیعہ مذہب سے جوڑ دیا ہے اور یہ تصور دینے کی کوشش کی ہے کہ شیعہ مذہب بادشاہان وقت کے ظلم وجور کے باوجود بھی اپنی جڑیں مضبوط کرتا رہا اور پھلتا پھولتا رہا۔

مجلس دوم: یہ مجلس ان قوموں کے حالات پر مشتمل ہے جو مسلکاً اہل ایمان ہیں، اس میں اوس وخزرج، بنوحنیف، ہمدان، شبام، مذحج، ربیعہ، مضر، طے، بنوکمونہ، بنی مختار، موسویہ، رضویہ، بخاریہ، مرعشیہ، بوہرہ، صدریقیہ، ہزارۂ کابل، بلوچ، سندھی وغیرہ کا ذکر ہے۔

ہمدان: قاضی صاحب نے کتاب انساب کا حوالہ دیتے ہوئے ذکر کیا ہے کہ کوفہ میں اہل ہمدان بہ کثرت ہیں جن میں بیشتر عالم وزاہد ہیں اور تشیع میں مشہور ہیں، حضرت امیر المومنین نے اہل ہمدان کی جرأت، اخلاق، مہمان نوازی، نرمیٔ کلام، حسن معاشرت وغیرہ کا اپنے اشعار میں ذکر کیا ہے اور یہ بھی روایت ہے کہ حضرت علیؓ نے قبیلۂ ہمدان کی شان میں یہ شعر ارشاد فرمایا ہے۔

فلو کنت بوابا علی باب جنة   لقلت لهمدان ادخلی بسلام

(ترجمہ) اگر میں جنت کے دروازے کا دربان ہوتا تو ہمدان سے کہتا کہ امن وسلامتی سے داخل ہو جاؤ۔

بیہقی کے حوالے سے قاضی صاحب رقم طراز ہیں کہ ''جب امیر المومنینؑ نے یمن سے رسالت مآب ﷺ کے نام خط لکھا کہ قبیلۂ ہمدان کے لوگ مشرف بہ اسلام ہوگئے تو آنحضرت ﷺ نے سجدۂ شکر ادا فرمایا (۳۷) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کو اہل ہمدان سے خاص انسیت تھی اور اہل ہمدان کا مرتبہ بلند تھا۔

شام: یمن کا ایک شہر ہے یہاں کے تمام باشندے شیعہ ہیں اور یہ قبیلۂ ہمدان کا ایک گروہ ہے جو

کوفہ میں آکر بس گیا تھا عبدالجبار بن عباس شامی ہمدانی اسی گروہ سے تھے اور انہیں تشیع میں بہت غلو تھا (۳۸)

بخاریہ: بخاریہ کا ذکر کرتے ہوئے قاضی صاحب لکھتے ہیں۔

''یہ سادات عظام کا ایک بڑا گروہ ہے جو ہندوستان کے مختلف شہروں میں اقامت پذیر ہے ان کے جد اعلا سید جلال عراق سے بخارا آئے اور وہاں کے مروانیوں سے تنگ ہوکر کابل کی طرف روانہ ہوگئے پھر ہندوستان آئے اور یہاں مدتوں تقیہ کے ساتھ بسر کرتے رہے اور سلاطین ہندان کی بے حد تعظیم وتکریم کرتے تھے مگر ان کی اکثر اولاد نے لمبے عرصے تک کے تقیہ سے گھبرا کر اپنا آبائی مذہب چھوڑ دیا اور دنیاداری اور جہالت کے سبب گمراہ ہوگئے لیکن ان میں سے کچھ جیسے سید راجو نے ہمیشہ مذہب حق کی جستجو کی اور تقیہ اور سلطنت چغتائیہ سے اپنے دامن کو پاک رکھا (۳۹)۔

قاضی صاحب نے ضمناً بوہرہ، صدریقیہ، ہزارہ، کابل، نیز بلوچیوں کا ذکر بھی مجلس دوم میں کیا ہے اور سب کے مذہب کے سلسلے میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اکثر شیعہ ہیں، جیسے بوہرہ کے سلسلے میں وہ لکھتے ہیں کہ۔

''ملک ہند میں ان لوگوں کی آبادی قریباً تیس ہزار ہے جو شہر ملتان، لاہور، دہلی اور گجرات میں رہتے ہیں اور اکثر تجارت پیشہ ہیں یہ لوگ اپنے مال کا خمس اپنے پیر سید کبیر کی اولاد کو دیا کرتے ہیں، اور پیر، مرید وسادات اور ان کے اتباع سب ہی شیعان اہل بیت میں سے ہیں'' (۴۰)۔

مجلس سوم: تیسری مجلس اکابر شیعہ کے تذکرے پر مشتمل ہے اور اس میں مشاہیر وسادات بنی ہاشم کے حالات درج ہیں۔

مجلس چہارم: اس مجلس میں زمرہ تابعین کے اکابر دین ومومنین کا ذکر ہے اور تقریباً سو سے زائد لوگوں کے بارے میں لکھا ہے وہ حضرت امیرؑ کی محبت میں سرشار اور ان کی صحبت سے فیض یاب ہوئے ہیں جو سب شیعہ تابعین میں سے تھے، قاضی صاحب کے خیال میں کہ تابعین وتبع تابعین میں شیعوں کی تعداد زیادہ تھی۔

قاضی صاحب نے لکھا ہے کہ جن لوگوں نے سلیمان بن خزاعی یا ان کے بعد مختار بن ابی عبید ثقفی کا ساتھ دیا اور بنی امیہ پر خروج کیا وہ سب شیعہ تابعی تھے جن کو حضرت امیرؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ سے شرف صحبت حاصل تھا اسی طرح سے وہ لوگ جو زمانہ بنی امیہ اور بنی عباس میں بزرگان سادات علویہ مثل زید بن علی اور ابراہیم محمد و یحیٰی کے ہمراہ تھے وہ سب شیعہ تھے اور ابوسلمہ خلال جو رئیس اہل عراق اور وزیر آل محمد کے نام سے مشہور تھے، تین سو برس اسماعیلی خلفا کی سلطنت مغرب، مصر، شام، حلب اور حرمین شریفین میں رہی، آل ہمدان وغیرہ بھی شیعہ تھے اور سادات رفیع الدرجات اہل مدینہ جو کہ اپنے آبائے طاہرین کے زمانہ سے امامیہ اثناعشری تھے اور ہیں مکہ معظمہ کے شیعہ جو جارودی زیدی ہیں یہ کبھی اپنے مذہب کو نہیں چھپاتے بلکہ ان کے غلبہ کے سبب سے اہل سنت ان کی خوشامد کرتے تھے اور کہتے تھے کہ مذاہب شیعہ میں سب سے بہتر مذہب اصحاب زید بن علی کا ہے اسی طرح سے قاضی صاحب نے بہت سے لوگوں کو شیعہ مذہب سے منسلک کرنے کی کوشش کی ہے۔

مجلس پنجم: اس مجلس میں متکلمین، محدثین، مفسرین، فقہا، مجتہدین اور اہل لغت کا ذکر ہے۔

مجلس ششم: اس مجلس میں صوفیا کرام کا تذکرہ ہے، اس میں انہوں نے صوفیا کا ذکر کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ انہیں کی ہمتوں اور برکتوں سے دین و دولت کے ستون قائم ہیں، یہ خود بے برگ و نوا ہیں مگر ان کے جود و کرم کی بارش سے دنیا سیراب ہے۔

صوفیا کے ذکر میں قاضی صاحب نے یہ کہا ہے کہ شیعوں کی طرح صوفیا کے بھی بہت سے فرقے ہیں لیکن ان میں سے ایک ہی فرقہ برحق ہے اور وہ وہی ہے جو ظاہراً و باطناً زیور ایمان سے آراستہ ہے، جس طرح شیعوں کے بہت سے فرقوں میں ناجی وہی فرقہ ہے جو امامیہ اثناعشریہ ہے جس کے عقائد و احکام حضرت پیغمبر اور اہل بیت سے صحیح روایات سے ماخوذ ہیں (۴۲)، قاضی صاحب کا اعتقاد ہے کہ اس طائفہ میں سوائے نقش بندیوں کے اور کوئی سنی نہیں ہے، جنہوں نے اہل سنت کو فریب دینے کے لیے نقش تصوف خلیفۂ اول سے آراستہ کیا ہے اور اپنے فرقۂ طریقت کو اس سے نسبت دی ہے، اس کے بعد سلسلوں کی بحث کرتے ہوئے قاضی صاحب نے یہ ثابت کیا ہے کہ سوائے سلسلہ مرتضوی کے، اور کوئی سلسلہ جہاں میں باقی نہیں، اس فصل سے

جہاں اور باتوں کا پتہ چلتا ہے وہیں یہ علم بھی ہوتا ہے کہ شیعوں میں بھی تصوف موجود ہے (۴۳)۔

مجلس ہفتم: یہ مجلس مشہور حکمائے اسلام و متکلمین پر ہے، اس میں بوعلی سینا کا ذکر یوں کرتے ہیں۔

"الشیخ الرئیس ابوعلی عبداللہ قدس سرہ طور سینا و حکمت و عرفاں و نور دیدہ
حکیمان جہاں کہ روان افلاطون زیر بار منت او و روح ارسطو از مشائیان رکاب
حکمت او از اکابر علمائے اسلام و اعاظم فلاسفہ اعلام است" (۴۴)۔

مجلس ہشتم: یہ مجلس نامور سلاطین کے ذکر میں ہے۔ مجلس نہم: یہ مجلس امرا، سپہ سالاروں اور شہ سواروں پر مشتمل ہے۔ مجلس دہم: یہ مجلس کبار وزرا اور کاتبان کرام پر مشتمل ہے۔
مجلس یازدہم: اس میں شعرائے عرب کا ذکر ہے۔ مجلس دوازدہم: اس میں شعرائے عجم کا ذکر ہے۔

مجالس المومنین کے بارے میں آفندی کا کہنا ہے کہ یہ ایک اہم کتاب ہے جس میں شیعہ علما اور ان کے راویوں کی ایک جماعت اور فرقہ امامیہ کے مشہور بادشاہوں، امرا، صوفیا اور شعرا کی ایک جماعت کا ذکر ہے، اس کتاب کے لکھنے میں انہوں نے افراط و تفریط سے بھی کام لیا ہے (۴۵) لیکن علمی و ادبی حیثیت سے بھی اس کا درجہ بلند ہے، اس سے قاضی صاحب کے حسن تحریر، بہتر صلاحیت، مطالعہ کی گہرائی اور محنت و کاوش کا بین ثبوت ملتا ہے، یہ فصاحت و بلاغت، سلاست، لطافت اور نفاست کی خوبیوں سے بھی مالا مال ہے، اسلوب بیان حد درجہ بلیغ ہے لیکن بعض جگہ مخالفین کی نسبت ایسی زبان استعمال کی گئی ہے جو ایک علمی کتاب کے شایانِ شان نہیں مثلاً مخدوم الملک لاہوری کی نسبت لکھتے ہیں "شنیدہ شد کہ از جموشی و عقوری ملا عبداللہ لاہوری مشہور بہ مخدوم الملک کہ مخدوم کرہ مروان حمار و سگ بچہ معاویہ و یزید خمار بود" (۴۶)، اشخاص کے علاوہ بعض جگہ قوموں اور ملکوں کے لیے بھی درشت اور مبتذل الفاظ استعمال کیے ہیں جیسے سید جلال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سید جلال عراق سے بخارا آئے اور وہاں کے مروانیوں کی صحبت سے عاجز ہوکر دار الحرب کابل کی طرف روانہ ہوگئے لیکن جب اہل کابل کے دلوں کو بھی اہل بخارا کی طرح سنگ خارا پایا تو وہاں سے ملک ہند کی طرف روانہ ہوئے اور یہ شعر اہل کابل و بخارا کی شان میں کہا:

قتل عام آرزو دارم ہلاکو خاں کجاست، زانکہ از سرحد کابل تا بخارا کشتنی است

مجالس المومنین کی ایک خصوصیت جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے، وہ یہ کہ اس میں شیعہ عقائد کا انتساب ایسی برگزیدہ ہستیوں سے کیا گیا ہے جنہیں عام طور سے اہل سنت و جماعت سمجھا جاتا ہے مثلاً بادشاہوں میں ہارون رشید، مامون رشید، حکما میں بوعلی سینا، نصیر الدین طوسی، جلال الدین دوانی، شعرا میں سعدی، حافظ، رومی، متنبی، صلحا میں بایزید بسطامی، سلطان ابراہیم ادہم، شیخ شہاب الدین سہروردی وغیرہم کو شیعہ ظاہر کیا گیا (۴۸)۔

مجالس المومنین میں تمام دنیا کے شیعہ حکما، علما، زعما اور شعرا کے حالات ملتے ہیں اور اس سے ضمناً کشمیر، بلوچستان، سندھ، تبت، گجرات اور دکن کے شیعہ حضرات سے متعلق بھی معلومات فراہم ہوتی ہیں، اس لیے یہ کتاب مسلم ہندوستان کی مذہبی و علمی تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے ایک اہم اور دل چسپ ماخذ ہے، کتاب کی ابتدا میں مولانا شوشتری نے لکھا ہے کہ ''صفویوں کی حکومت سے پہلے شیعہ اہل قلم اپنی تصنیفات محفوظ نہیں رکھ سکتے تھے لیکن صفویوں کے سبب زبان کھولنے کی جرأت ہوئی ہے تو سوال یہ اٹھتا ہے کہ جن شیعہ علما و زعما کا ذکر انہوں نے کیا ہے، ان کی تصنیفات کیسے محفوظ رہ گئیں اور مسلمانوں کے تمام فرقوں نے بلا امتیاز انہیں کیسے حرز جان بنایا۔ علاوہ بریں یہ بھی سمجھنا مشکل ہے کہ شیخ شہاب الدین سہروردی اور رومی وغیرہ جیسے بزرگوں کو شوشتری صاحب نے کس طرح شیعہ تصور کرلیا، تاریخی لحاظ سے یہ بات بھی ناقابل فہم ہے کہ صفوی سلاطین کے زمانے میں شیعوں کو زبان کھولنے کا موقع ملا کیوں کہ خاندان بویہ شیعہ تھا اور اس کے زمانے میں شیعی عقائد کی تبلیغ و اشاعت ہوئی، شیعی احادیث کی کتابیں اور نہج البلاغہ مرتب و مدون ہوئیں اور تشیع ہی مملکت کا سرکاری مذہب تھا، یہ خاندان پورے عراق و ایران پر ۹۴۵ء سے ۱۰۵۵ء تک قابض رہا، حقیقت یہ ہے کہ اسی صدی میں تین شیعی حکمراں خاندان دنیائے اسلام میں برسر اقتدار تھے، مغرب سے لیجیے تو پہلے بنی فاطمہ صقلیہ سے لے کر پورے حجاز اور فلسطین تک حکومت کر رہے تھے، پھر سارے عرب پر قرامطہ کا دور دورہ تھا اور ایران، عراق، آل بویہ کے زیرنگیں تھے، ایسی صورت میں یہ کہنا کہ فقط صفویوں کے عہد ہی میں شیعہ عقائد کی ترویج و اشاعت ہوئی صحیح نہیں۔

ماخذ

(۱) اطہر عباس رضوی، شمالی ہندوستان میں مسلم احیائی تحریکیں (انگریزی)، ص ۳۳۳ (۲) القاضی نوراللہ شوشتری، ''احقاق الحق وازہاق الباطل'' تعلیقات السید شہاب الدین الحسینی المرعشی النجفی، ج ۱، مکتبہ مرعشی قم ایران، ''مقدمہ فب'' مولوی سید محمد حسین نوگانوی تذکرہ بے بہائی تاریخ العلما، ص ۴۱۲، مرزا محمد ہادی، شہید ثالث، ص ۱۴، نامی پریس لکھنؤ، ۱۹۲۵ء، سید صغیر حسن شمس زیدی، صحیفہ نور، ص ۱۵ (۳) احقاق الحق مقدمہ حوالہ مذکورہ، ص فد (۴) ایضاً مقدمہ ص فج، صحیفہ نور حوالہ مذکورہ (۵) مرزا محمد ہادی حوالہ مذکورہ ص ۱۴، ۱۵ (۶) احقاق الحق مقدمہ حوالہ مذکورہ، ص فد، صحیفہ نور حوالہ مذکورہ ص ۱۸، شہید ثالث، حوالہ مذکورہ ص ۱۴ (۷) صحیفہ نور ص ۱۹، شہید ثالث ص ۱۵، محمد بختاور خاں مرآۃ العالم، دانش گاہ پنجاب لاہور ۱۹۷۹ء، ج ۲، ص ۴۳۹ (۸) اطہر عباس رضوی، ص ۳۱۵، احقاق الحق حوالہ مذکورہ مقدمہ فد محمد بختاور خان حوالہ مذکورہ، ص ۴۳۹ (۹) نجوم السماء ص ۱۴، ۱۵، تذکرہ فارسی خاص رام پور، رضا لائبریری، رام پور (۱۰) ایضاً ص ۱۵ (۱۱) ایضاً، محمد اکرام رود کوثر، ص ۴۰۰ (۱۲) نجوم السماء ص ۱۶، تذکرہ خاص فارسی، رضا لائبریری، رام پور، محمد اکرام رود کوثر، ص ۴۰۱، مرزا ہادی، شہید ثالث ص ۲۴، اطہر عباس رضوی حوالہ مذکورہ، ص ۳۱۴ (۱۳) صباح الدین عبدالرحمن، ہندوستان کے سلاطین علما و مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، ص ۱۷۴، معارف پریس، اعظم گڈھ (۱۴) عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ اردو، ص ۴۶۰، مطبع نول کشور، ۱۸۸۹ء، (۱۵) جلال الدین حسینی، الصوارم المہرقہ فی نقد الصواعق المحرقہ (نوراللہ شوشتری)، تصحیح جلال الدین حسینی، ص لہ (۱۶) ایضاً (۱۷) ایضاً (۱۸) مواقف المومنین ترجمہ مجالس المومنین (مترجم سید محمد بشیر صاحب، ص ۳) تذکرہ اردو خاص رام پور، رضا لائبریری (۱۹) ایضاً ص ۴ (۲۰) نوراللہ شوشتری، مجالس المومنین (فارسی)، ص ۳۰ (۲۱) مواقف المومنین ترجمہ مجالس المومنین حوالہ مذکورہ، ص ۳۹ (۲۲) ایضاً ص ۳۹ (۲۳) ایضاً ۴۰ (۲۴) ایضاً ص ۴۱ (۲۵) ایضاً ص ۴۳ و ۴۴ (۲۶) ایضاً ص ۴۵ (۲۷) ایضاً ص ۶۸ (۲۸) ایضاً ص ۷۰ (۲۹) ایضاً ص ۸۵ (۳۰) ایضاً ص ۱۰۳ (۳۱) ایضاً ص ۱۰۵ (۳۲) ایضاً ص ۱۵۴ (۳۳) ایضاً ص ۱۵۵ (۳۴) ایضاً ص ۱۵۶ (۳۵) ایضاً (۳۶) ایضاً ص ۱۷۱ (۳۷) ایضاً (۳۸) ایضاً ص ۱۷۵ (۳۹) ایضاً ص ۱۹۴ و ۱۹۵ (۴۰) ایضاً ۲۰۲ (۴۱) ایضاً ص ۲۸۲ و ۲۸۳ (۴۲) صحیفہ نور حوالہ مذکورہ ص ۴۹ (۴۳) ایضاً ص ۴۹ (۴۴) مجالس المومنین (فارسی) ص ۲۳۰ (۴۵) جلال الدین حسینی، الصوارم المہرقہ فی نقد الصواعق المحرقہ (نوراللہ شوشتری) ص مذ (۴۶) شیخ محمد اکرام، رود کوثر، دہلی ۱۹۹۱ء، ص ۴۰۴ (۴۷) مواقف المومنین ترجمہ مجالس المومنین، ص ۱۹۵ (۴۸) شیخ محمد اکرام حوالہ مذکورہ، ص ۴۰۴۔

○○○○

اخبار علمیہ

آسٹریلیا کے شہر ''سڈنی'' میں ''شاہ فیصل اسلامک کالج'' کا افتتاح وہاں کے وزیر اعظم جان ہاورڈ نے کیا، اس تقریب میں سعودی سفیر جناب حسن طلعت ناظر اور مختلف طبقوں کے عمائد شہر بھی شریک تھے، افتتاحی تقریر میں وزیر اعظم نے اعتراف کیا کہ اسلام کے تعارف اور اس کی تبلیغ و اشاعت میں سعودی حکومت کی خدمات ناقابل فراموش ہیں، ان سے حجاب کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ آسٹریلیا کے دستور اور قانون میں اس کے تمام باشندوں کو مذہبی آزادی دی گئی ہے، اس لیے حجاب پر پابندی عائد کرنا آسٹریلیا کے دستور کے منافی ہے، وزیر اعظم نے دہشت گردی کے خاتمہ میں آسٹریلیا کے مسلمانوں کے مکمل تعاون پر اطمینان ظاہر کیا، رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ آسٹریلیا کی ریاست کوئینز لینڈ میں اسلام قبول کرنے والے عیسائیوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا ہے۔

''اسلام آن لائن'' کی رپورٹ کے مطابق افریقی ممالک کے زیادہ تر اسکول کیتھولک ہیں، نجی اور پرائیویٹ اسکولوں کی تعداد بہت کم ہے اور یہ جس قدر ہیں اتنے مہنگے ہیں کہ وہاں کے مسلمان ان کے تعلیمی اخراجات کے متحمل نہیں ہوسکتے ہیں، تجزیہ نگاروں کے خیال میں افریقی ملک موزمبیق کے مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی ناگفتہ بہ ہے، اس کا سبب مخصوص ملکی نظام تعلیم، تعلیم کی گرانی اور اسلامی اسکولوں کی کمی ہے جو ان کی ترقی میں بھی بڑی رکاوٹ ہے، دلچسپی اور خواہش کے باوجود بھی وہاں کے مسلمان اپنے بچوں کو اعلا اور معیاری تعلیم سے آراستہ نہیں کرسکتے، یہی وجہ ہے کہ موزمبیق کے مسلمانوں میں جہالت کی شرح بہت زیادہ ہے۔

جامعہ ازہر نے بچوں کے حقوق پر ایک نئی درسی کتاب شائع کی ہے، اس میں بچوں کی تعلیم و تربیت، نگرانی اور حفظان صحت کے متعلق اسلام کے رہنما اصول اور مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں، الازہر یونی ورسٹی کے امام سید محمد طنطاوی نے کہا کہ اسلامی شریعت نے بچوں کے حقوق اور تعلیم و

تربیت کی جانب خصوصی توجہ دلائی ہے اور اس جدوجہد میں باہمی تعاون پر بھی زور دیا ہے، رپورٹ کے مطابق یہ کتاب عالمی تنظیم یونیسیف چلڈرنس فنڈ کے تعاون اور اشتراک سے شائع کی گئی ہے۔

''اکنامک ٹائمز'' کی خبر ہے کہ ڈاکٹر ریڈی فاؤنڈیشن کے زیر انتظام حیدرآباد کی ایک غیر سرکاری تنظیم این جی او نے ۵ ہزار کشمیری نوجوانوں کو پیشہ ورانہ تربیت سے آراستہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے، جس کو ریاستی حکومت نے منظوری بھی دے دی ہے، چار چار مہینے کے ان کورسز کا تعلق ریلوے، سیاحت، الیکٹرانکس اور آٹوموبائلز جیسے شعبوں سے ہوگا، جموں و کشمیر کے وزیر پیرزادہ محمد سعید نے کہا کہ اس مختصر مدتی کورس کی منظوری اس لیے دی گئی ہے تاکہ دیہی معیشت کی ترقی اور ریاست کی خوش حالی میں اضافہ ہو۔

فضا کو آلودہ کردینے والی مشینوں، کارخانوں اور فیکٹریوں سے نکلنے والی کاربن ڈائی آکسائیڈ کو سائنس داں قید کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں، انہوں نے ایسے باریک ذرے بنائے ہیں جو اپنے اندر بھاری مقدار میں کاربن ڈائی آکسائیڈ جذب کر کے اسے خشک کرسکتے ہیں، اس ٹکنک کی ایجاد کا سہرا مشیگن یونی ورسٹی کے سائنس داں اومریاگی کے سر ہے، اپنے انٹرویو میں انہوں نے کہا کہ یہ باریک ذرے ''میٹل آرگینک فریم ورک'' کے نام سے جانے جاتے تھے اور جو ابھی تک صرف میتھن اور آکسیجن گیسوں کو سکھانے کے سبب کے طور پر جانے جاتے تھے، ہم نے محض اس میں خشک کرنے کی صلاحیت بڑھادی ہے اور اس طرح فضائی آلودگی کم کرنے کی ٹکنک ایجاد ہوچکی ہے۔

''ڈیلی میل'' لندن میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ سائنس دانوں نے قوت حافظہ یعنی یادداشت کے کمزور ہونے کے راز سے پردہ اٹھاتے ہوئے یہ انکشاف کیا ہے کہ اس کی وجہ ذہن و دماغ میں فضول اور لایعنی باتوں کو رکھنا ہے، ان کا کہنا ہے کہ اگر غیر ضروری اور نامناسب خیالات کو اپنے ذہن میں جگہ نہ دی جائے تو یادداشت اچھی اور مضبوط ہوگی، ان کے مطابق فضول اور غیر ضروری معلومات سے صرف نظر کرنا ہی قوت حافظہ کو مضبوط اور بہترین یادداشت کو باقی رکھ سکتا ہے۔

سائنس دانوں میں اب تک یہ مانا جارہا تھا کہ زمینی آب و ہوا میں آکسیجن کی موجودہ سطح دو مرتبہ اچانک تبدیلی یا اچھال کے بعد پیدا ہوئی، ان کا خیال تھا کہ ۲ء۴-ارب برس پہلے زمین

میں آکسیجن کی مقدار بے انتہا تھی اس کے بعد ۶ کروڑ سال پہلے بہت تیزی سے اچھال اور اچانک تبدیلی ہوئی لیکن میری لینڈ یونی ورسٹی کے ماہرین ماحولیات نے اس کے برعکس یہ خیال پیش کیا ہے کہ آکسیجن کی سطح میں دوسری تبدیلی اچانک نہیں بلکہ بہت دھیرے دھیرے ہوئی اور اس کا آغاز پہلے ہی سے ہو چکا تھا، اس کی تفصیلی رپورٹ ''نیچر'' ۲؍دسمبر کے شمارے میں شائع ہوئی ہے۔

یونی ورسٹی آف کولوراڈو کے ماہرین آثار قدیمہ کو شمال امریکہ کے جزیرہ موآبہ کے قریب سیڈر پہاڑوں پر ایسے راستے دستیاب ہوئے ہیں جن میں ۱۲۵ ملین برس قبل چلنے والے پرندوں کے نقوش پا موجود ہیں، ''سالٹ لیک سٹی ڈیزرٹ'' میں شائع رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ پرندوں کا یہ سب سے قدیم دریافت شدہ راستہ ہے جو سلیٹی پتھروں سے ہو کر گزرتا ہے، محققین کے مطابق اس قدیم راستہ کا عہد قریب قریب وہی ہے جو اس صدی کی اہم دریافت ڈائنا سوروں کا ہے، ماہرین نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ یہ بتانا نہایت مشکل ہے کہ اس زمانہ کے پرندے کس طرح کے رہے ہوں گے، موجودہ زمانے کے پرندوں پر انہیں قیاس کرنا درست نہیں ہوگا۔

''اخبار تحقیق'' اسلام آباد میں شائع خبر کے مطابق ''آکسفورڈ انسائیکلو پیڈیا آف اسلامک ورلڈ'' کی ترتیب و تدوین کی تجویز زیر غور ہے، یہ انسائیکلو پیڈیا مذہب اسلام اور متعدد مسلم معاشروں کے طور طریقوں، سیاست، اقتصادیات، روزمرہ زندگی کے معمولات اور تہذیبی پہلوؤں پر مشتمل ہوگی اور اس میں ۱۹۹۵ء میں شائع ''آکسفورڈ انسائیکلو پیڈیا آف دی ماڈرن اسلامک ورلڈ'' کے مندرج ضروری موضوعات کو نظر ثانی اور تازہ ترین معلومات کے ساتھ بھی شامل کیا جائے گا، اس کی چھ جلدیں ہوں گی اور اسے لائبریری کے لیے تیار کیا جائے گا لیکن طلبہ، دانش ور، سیاسی تجزیہ نگار، صحافی وغیرہ بھی اس سے استفادہ کر سکیں گے، توقع ہے کہ ۲۰۰۸ء تک یہ زیور طبع سے آراستہ ہو کر اہل علم کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گی اور اس کو ایک ویب سائٹ پر بھی فراہم کر دیا جائے گا، اس کے چیف اڈیٹر ڈاکٹر جان ایسپوزیٹو ہیں اور ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری ڈائرکٹر ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد کو اس کا سینئر مشیر مقرر کیا گیا ہے۔

ک، ص اصلاحی

0000

وفیات

آہ! ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

از:- جناب رفیق احمد خاں☆

''جناب مشفق خواجہ کا غم ابھی تازہ ہی تھا کہ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان اور ڈاکٹر سید معین الرحمن نے بھی داغ مفارقت دیا، یہ دونوں بزرگ علم و ادب کے آسمان پر مہر وماہ بن کر ضوفشاں تھے، یقینا قارئین معارف رفیق احمد خاں صاحب کے ممنون ہوں گے کہ انہوں نے ان دونوں مقتدر علمی و ادبی شخصیتوں پر مقالہ سپرد قلم کیا، عتیق جیلانی صاحب کے بھی ہم ممنون ہیں کہ انہوں نے بھی ڈاکٹر غلام مصطفےٰ صاحب پر اپنے مضمون سے قارئین معارف کو متمتع ہونے کا موقع بخشا، قارئین معارف کو مشفق خواجہ صاحب پر بھی کسی پاکستانی صاحب قلم کے مضمون کا انتظار رہے گا''۔ (ض)

ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب (م: ۲۵؍ستمبر ۲۰۰۵ء) کے بارے میں کچھ عرض کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے، وہ کسی تعریف یا تعارف کے محتاج نہیں، ڈاکٹر صاحب کی شخصیت قدر و منزلت کے اعتبار سے کئی پہلو رکھتی ہے، تاہم دو پہلو صاف، واضح اور روشن ہیں، ایک ''محقق'' دوسرے ''مذہبی اور روحانی عالم''۔

تحقیق کے اصل اور حقیقی تقاضوں سے محققین و فضلا ہی آگاہ ہوتے ہیں اور وہی جانتے ہیں کہ انہیں کیوں کر نبھایا جاتا ہے، تحقیق ایک خاص طرز زندگی کا مطالبہ کرتی ہے، ڈاکٹر صاحب نے

☆ شعبۂ اردو، سندھ یونی ورسٹی، لاہور۔

ایک مقام پر لکھا ہے "ہم کہہ سکتے ہیں کہ تحقیق کو بہ طور ایک طرز زندگی اپنانا ہی اولین اور بنیادی اور لازمی شرط ہے"۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ اسی خاص انداز سے گزار کر اس جہان فانی سے دائم آباد کو رخصت ہوئے، ان کی زندگی ہمارے لیے قابل فخر اور لائق تقلید ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی متعدد خوبیوں میں سے صرف دو کا تذکرہ کرنا نہایت ضروری سمجھتا ہوں کہ انہیں بنیادی اور اساسی حیثیت حاصل ہے، یعنی "احتیاط" اور "احترام"، جس طرح "سچ" کی تلاش کو تحقیق کا لازمی عنصر قرار دیا گیا ہے، اسی طرح "احتیاط" کو بھی اس کا جز ولاینفک تسلیم کیا گیا ہے، بہ حیثیت محقق ڈاکٹر صاحب تمام زندگی سچ اور احتیاط کا دامن تھامے رہے۔

بہ حیثیت مذہبی اور روحانی عالم ڈاکٹر صاحب بلا امتیاز عمر اور علم، زبان، رنگ، نسل اور قومیت ہر ایک کا حد درجہ احترام کیا کرتے تھے، یہ انہی کا روحانی تصرف ہے کہ آج ان کے حلقۂ ارادت میں ہر زبان کے بولنے والے اور ہر طبقۂ فکر کے اشخاص یک جا اور یک جان ہیں اور ڈاکٹر صاحب سے عقیدت ومحبت میں یکساں جذبات کے حامل ہیں۔

اس امر سے کون آگاہ نہیں کہ احتیاط اور احترام کے اختیار کرنے میں بلا کے حوصلے، برداشت اور استقلال کی ضرورت ہوا کرتی ہے، ہمیں اپنی زندگی میں کیسے کیسے مرحلے اور مواقع پیش آتے ہیں کہ صبر، حوصلے اور ہمت کا دامن چھوٹ چھوٹ جاتا ہے اور اس احتیاط اور احترام کے برتنے میں کیسی کیسی لغزشیں اور کوتاہیاں سرزد ہوتی ہیں، یقیناً ڈاکٹر صاحب کے یہ دو وصف خاص بھی مثالی اور استثنائی شان رکھتے ہیں اور پیروی وتقلید کی دعوت دیتے۔

ڈاکٹر صاحب کے تلامذہ کی تعداد بھی خاصی ہے اور قابل تعریف بات یہ ہے کہ بڑی تعداد ان تلامذہ کی بے جواب فضلا کے درجے پر فائز ہیں، انہوں نے اپنے نام سے اپنے استاد گرامی کے نام کی لاج رکھی اور سرفخر سے بلند کیا۔

بہ حیثیت محقق ڈاکٹر صاحب کے کام اور طرز زندگی کی پیروی وتقلید ان کے عزیز ترین شاگرد ڈاکٹر نجم الاسلام مرحوم (مدیر رسالہ تحقیق) نے سب سے زیادہ اختیار کی اور ویسے ہی نام ور ہوئے اور برصغیر پاک وہند میں استاد اور شاگرد کے مثالی رشتے کی یاد تازہ کردی۔

ڈاکٹر صاحب کے روحانی رنگ کو ان کے ایک اور عزیز ترین شاگرد ڈاکٹر مسعود احمد خاں صاحب نے قبول ومقبول کیا، وہ بھی اپنے استاد محترم کی طرح ارادت مندوں کے ایک بڑے حلقے کے مرکز ومحور ہیں، ان کے فیوض وبرکات کا سلسلہ ہنوز جاری ہے، اللہ تعالیٰ سلامت باکرامت رکھے۔

اب میں ڈاکٹر صاحب کے چند اختصاصات واولیات کا ذکر کرنا بھی ناگزیر سمجھتا ہوں:

۱- ڈاکٹر صاحب نے پہلی مرتبہ جامعات میں ایم - اے کی سطح پر اسلامیات، اقبالیات، فارسی اور عربی زبانوں کو نصاب میں داخل کیا۔

۲- نعتیہ شاعری کو بی - اے کے نصاب میں اور نعتیہ مشاعروں کو ہم نصابی سرگرمی کے طور پر پہلی مرتبہ متعارف کروایا۔

۳- ڈاکٹر صاحب نے شعبۂ اردو جامعہ سندھ میں بہ حیثیت صدر شعبہ سب سے زیادہ مدت (۱۹۵۶-۷۶ء) کے لیے خدمات انجام دیں۔

۴- برصغیر میں ڈاکٹر صاحب پہلے استاد ہیں جن کی نگرانی میں زیادہ پی ایچ ڈی اسکالرز نے اپنے کام مکمل کیے۔

۵- پی ایچ ڈی کی سطح پر اردو اور قرآن کے حوالے سے مربوط ومنضبط کام بھی سب سے زیادہ ڈاکٹر صاحب ہی کی نگرانی میں ہوئے۔

۶- ڈاکٹر صاحب وہ پہلے شخص ہیں جن کی زندگی میں پاکستان میں ان پر پی ایچ ڈی ہوا۔

۷- سندھی ادبی بورڈ کے مخطوطات کے ایک بڑے اور نادر وقیمتی ذخیرے کے کیٹالاگنگ کی جانب ڈاکٹر نجم الاسلام کو توجہ اور رہنمائی فراہم کرنے کا امتیاز بھی ڈاکٹر صاحب ہی کو حاصل رہا۔

۸- ڈاکٹر نجم الاسلام مرحوم کو ابیات شاہ کریم (اکتوبر ۸۷ء) اور ابیات سندھی (جنوری ۹۹ء) کے اردو منظوم ترجمے کی ترغیب بھی ڈاکٹر صاحب ہی کا امتیازی وصف ہے۔

اپنے علم کے مطابق اور بہت قلیل وقت میں، میں نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کے چند اختصاصات کا تذکرہ کردیا ہے، حقیقتاً ڈاکٹر صاحب کی خوبیوں اور کمالات کا نہ ہمیں صحیح علم ہے

اور نہ ہم ان کو حیطۂ تحریر و بیان میں لانے کی قدرت و صلاحیت رکھتے ہیں، '' اللہ تعالیٰ ان پر لاکھوں کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے'' اور ہمیں ان کی تقلید کا انھی جیسا شوق، جذبہ اور طاقت عطا فرمائے۔

علامہ اقبال نے اپنی والدہ سے شدید محبت کا اظہار ایک نظم '' والدہ مرحومہ کی یاد میں '' کیا تھا، ڈاکٹر صاحب کو علامہ اقبال اور ان کے خیالات سے بڑی محبت تھی، میں علامہ کی اسی نظم سے چند اشعار ڈاکٹر صاحب کی یاد میں پیش کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ آخرت میں انہیں اعلا درجات سے سرفراز فرمائے اور مجھ عاجز کو ان قلبی جذبات اور تعلق خاطر کے عوض نجات اخروی عطا ہو۔

یاد سے تیری دل درد آشنا معمور ہے — جیسے کعبے میں دعاؤں سے فضا معمور ہے
زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر — خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر
مثل ایوان سحر مرقد فروزاں ہو ترا — نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے — سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

'' گھنے سایہ دار پیڑ ''

از- جناب عتیق احمد جیلانی ☆

اس جلتی دھوپ میں یہ گھنے سایہ دار پیڑ
میں اپنی زندگی انہیں دے دوں جو بن پڑے
(مجید امجد)

دھوپ کی بے رحم تمازت اپنے سروں پہ سہ کر خلق خدا کو سکون اور سایہ دینے والے یہ پیڑ قدرت کی کتنی بڑی نعمت ہیں، اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جنہیں زندگی کے جلتے بلتے راستے میں کسی پیڑ کی ٹھنڈی میٹھی چھاؤں میسر آئی ہو۔ کیسے دکھ کی بات ہے کہ نصف صدی سے لاکھوں بندگان خدا سائے کے لیے جس برگد پر تکیہ کیے ہوئے تھے، آج وہ ان کے درمیان نہیں رہا۔

☆ شعبۂ اردو، سندھ یونی ورسٹی، جام شورو۔

آج ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں جسمانی لحاظ سے ہمارے ساتھ نہیں مگر ان کی علمی یادگاریں اور ان کا روحانی فیضان تا قیامت باقی رہے گا، ان کی ساٹھ سے زائد علمی و ادبی تصانیف کا ایک ایک لفظ سرچشمۂ فیض اور نور ہدایت ہے، ان کے سچے پیرو کاروں کی ایک بڑی جماعت ان کی زندگی کا ثبوت ہے، ان کی محبت میں دھڑکتے لاکھوں دل پکار پکار کر کہہ رہے ہیں '' رفتید و لے نہ از دل ما ''۔

اہل عشق خودی کے اس درجے پر ہوتے ہیں کہ بہ قول اقبال:

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

اور حافظ شیراز نے ایسے ہی کاملین کو پیش نظر رکھ کر یہ بصیرت افروز اور دل کشا شعر کہا تھا کہ:

ہرگز نمیرد آن کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

خطۂ سندھ کے باشندوں پر ڈاکٹر صاحب کی ذات گرامی اللہ کا خاص انعام ہے، انہوں نے عرصۂ دراز تک اللہ کے بندوں میں محبتیں تقسیم کیں، وہ سراپا شفقت و عنایت تھے، ان کی شخصیت جلال سے زیادہ جمال کی آئینہ دار تھی، وہ اخلاق جمالی کا بہترین نمونہ تھے، فی زماننا ان کی ذات علما و اولیا و صلحائے سلف کے کمالات کی عمدہ مثال تھی، وہ بے غرضی، بے ریائی، استغنا، ہمدردی، خلوص اور عفو و درگذر کا پیکر تھے، ان ہی اوصاف کے سبب ان کی شخصیت میں خاص و عام کے لیے بے پناہ جاذبیت ہے اور بلا لحاظ رنگ و نسل بے شمار لوگ ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہیں۔

وہ ہر ملنے والے پر بے پایاں توجہ اور بے انتہا محبت کی چھتری تان دیتے تھے، ہر شخص کو یہی محسوس ہوتا کہ وہی ان کے زیادہ نزدیک ہے، حسن سلوک اور خیر خواہی کا نورانی ہالہ ہر ملاقاتی اور ہر مہمان کو اپنے حصار میں لیے رہتا، دعاؤں کی بارش برستی ہی چلی جاتی، لطف اور توجہ کا چراغ تاریک ذہنوں اور بے نور دلوں کو منور کرتا چلا جاتا، گفتگو سماعتوں کے قفل توڑتی اور خاموشی دلوں کے دریچے کھولتی۔

ڈاکٹر صاحب نے کلام اقبال کا گہرا مطالعہ کیا تھا، یہ اختصاص دوسرے بہت سے اہل علم کو

بھی حاصل ہے مگر ڈاکٹر صاحب کا کمال یہ ہے کہ ان کی زندگی بھی افکار اقبال کے سانچے میں ڈھل چکی تھی، اقبالؔ کے معروف تصورات عشق، خودی، فقر، استغنا، مومن، شاہین وغیرہ کو ذہن میں لایئے اور پھر عملی مثال تلاش کیجیے تو بغیر کسی تردد کے زبان پر ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں کا نام آجاتا ہے۔

ان کی بہت سی صفات میں استغنا کی صفت نمایاں ترین تھی، انہوں نے کبھی دنیا کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا اگرچہ دنیا ہر سمت سے ان کی طرف ملتفت رہی، یہ بے غرضی کوئی معمولی خوبی نہیں، اس مقام تک پہنچنے کے لیے فضلِ الٰہی کے ساتھ ساتھ مسلسل ریاضت اور گہری بصیرت بھی درکار ہوتی ہے، دنیا کی محبت میں سرتاپا آلودہ ہم جیسے ناشناسانِ حقیقت کیا جانیں کہ:

دو عالم سے کرتی ہے بے گانہ دل کو

عجب چیز ہے لذت آشنائی

ڈاکٹر صاحب جیسے مردِ مومن کی خوبیاں اپنے الفاظ میں بیان کرنے کے بجائے میں کلامِ اقبالؔ سے مدد لینا چاہوں گا، غور فرمایئے کہ ایک ایک لفظ کس طرح ڈاکٹر صاحب کی دل آویز شخصیت پر چسپاں ہوتا چلا جارہا ہے:

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ

غالب و کار آفریں، کار کشا، کار ساز

خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات

ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل

اس کی ادا دل فریب اس کی نگہ دل نواز

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو

رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز

اس تاثراتی تحریر کے اختتام پر یہی عرض کروں گا:

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید

نسیمے از حجاز آید کہ ناید

سر آمد روزگارے این فقیرے

دگر دانائے راز آید کہ ناید

مر گیا غالبِ آشفتہ نوا......

(بہ یادِ سید معین الرحمن)

از:- جناب رفیق احمد خاں- پاکستان

ڈاکٹر سید معین الرحمن ایک طرح سے میرے خواجہ تاش تھے، مرزا غالب اور رشید احمد صدیقی سے میرا عشق روحانی، جذباتی اور زبانی ہے اور ان کا عشق شخصی، روحانی، فکری، ادبی اور تحقیقی اوصاف کا مرقع، ان کی تن دہی، سخت کوشی، برداشت، نفاستِ طبع اور حسن آرائی و حسن آفرینی اس کی شہادتیں۔

میں اپنے احباب سے ان کی خوش اخلاقی، خوش اطواری، شائستگی اور روایتی وضع داری سے متعلق باتیں سن ہی چکا تھا، ان کی شگفتہ و مرصع اور پر مغز و پراثر نثر دل میں گھر کر چکی تھی اور ان کی سر کشیدگی اور بلند قامتی بھی میرے دل و نظر میں ایک مقام و مرتبہ وضع کر چکی تھی، خط و کتابت کا آغاز ہوا تو میرے خیالات و تصورات کو یک گونہ تقویت حاصل ہوئی، میں اپنے اندر ان کے لیے اپنائیت محسوس کرنے لگا اور یوں نیاز حاصل کرنے کی تمناجی میں سر اٹھانے لگی۔

اسی قلبی لگاؤ کا نتیجہ تھا کہ جب کبھی ان کے خلاف کوئی زہر آلودہ تحریر پڑھی تو طبیعت مکدر ہوگئی اور ان کی قدر و منزلت میں کسی طرح کی بھی کمی محسوس نہیں کی بلکہ اس میں اضافہ ہی محسوس کیا، ''دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ'' کے حوالے سے خواہ کچھ بھی کہا گیا یا لکھا گیا ہو مگر غالب سے غیر معمولی شیفتگی اور غالب کی طرف داری کا اس سے اچھا اور بڑا عملی ثبوت ادبی دنیا میں کم دیکھنے میں آئے گا، اس سے ہٹ کر دیکھیے تو پیش کش میں حسن اور سلیقے کا حسین امتزاج بھی کیا لائق تحسین نہیں، میر تقی میر کا یہ مصرع صادق آتا ہے:

ع کس خوش سلیقگی سے جگر خوں کروں ہوں میں

۲۰۰۳ء میں انجمن ترقی اردو، پاکستان کی صدی منائی گئی، سرسید یونی ورسٹی، کراچی کے پائین باغ میں انجمن ترقی اردو پاکستان، علی گڑھ اولڈ بوائز اور سرسید یونی ورسٹی، کراچی کے اشتراک سے تقریبات کا اہتمام کیا گیا، ایک روز مجھے بھی شرکت کا اعزاز حاصل ہوا، میرے علم میں تھا کہ لاہور سے نمایاں طور پر ڈاکٹر سید معین الرحمٰن اور ڈاکٹر تحسین فراقی مدعو ہیں، جاتے ہی میری مشتاق نظروں نے ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کو تلاش کرلیا، میں نے بڑھ کر سلام کیا، انہوں نے جواب دیا اور سینے سے لگایا، خیریت دریافت کی، ان کا تپاک سے ملنا اور دیر تک خوش دلی سے باتیں کرنا بھلایا نہیں جاسکتا۔

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں

جلسہ گاہ میں میرے پہنچنے سے قبل ہی ڈاکٹر صاحب اپنے زریں خیالات کا اظہار فرما چکے تھے، شومیِ قسمت کہ میری سماعت متمتع ہونے سے محروم رہی، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن سے میری یہ پہلی اور آخری ملاقات تھی جسے میں بجا طور پر ایک یادگار ملاقات کہہ سکتا ہوں، دوران گفتگو میں نے ڈاکٹر صاحب سے ان کی ایک کتاب ”شخصیات و ادبیات“ سے اپنی دل چسپی ظاہر کی، انہوں نے لاہور پہنچتے ہی رجسٹر ڈاک سے میرے شوق کو تسکین کا سامان مہیا کیا، اسی دوران نہایت سلیقے سے لفافے میں ملفوف ایک مکتوب بھی عنایت فرمایا، اس مکتوب کو ایک طرح سے اطلاع نامہ کہا جاسکتا ہے، مناسب خیال کرتا ہوں کہ بہ جائے تلخیص کے مکمل مکتوب برائے مطالعہ پیش کیا جائے، ملاحظہ کیجیے:

جناب مکرم ۲-نومبر ۲۰۰۲ء

میں محکمہ تعلیم سے اڑتیس (۳۸) اور 'جی سی' سے کوئی بائیس برس منسلک رہنے کے بعد ۴-نومبر ۲۰۰۲ء کو ریٹائر ہو رہا ہوں - فروری ۱۹۸۱ء میں سینیر پروفیسر اور شعبۂ اردو، پنجابی کے سربراہ کے طور پر 'جی سی' سے وابستہ ہوا، یہ میرا اعزاز ہے، میرے زمانہ تدریس کا بیشتر حصہ 'جی سی' میں گزرا - اسے آپ کی اور ادارے کے دوسرے احباب اور بزرگوں کی عنایت اور خدا کا احسان جانتا ہوں۔

'جی سی' میں آیا تو یہاں اردو میں صرف انٹر اور بی - اے تک کی کلاسز تھیں،

بائیس برس کی عملی وابستگی کے بعد جا رہا ہوں تو اطمینان ہے کہ مجھے پوسٹ گریجویٹ ڈیپارٹمنٹ بنانے کا امتیاز حاصل ہوا، ایم - اے (اردو) کے علاوہ ایم فل اور پی ایچ ڈی تک کے پروگرام رائج کرانے اور نصابات وضع کرنے اور منظور کرانے میں کامیابی پائی۔

اس تمام عرصے میں خود کسی قدر تصنیفی، علمی اور تحقیقی کام کرسکا، جسے ملک اور بیرون ملک کی یونی ورسٹیوں کے نصاب میں جگہ ملی - اس سے بھی بڑھ کر یہ اطمینان اور افتخار کہ میں اپنے رفقا اور تلامذہ کو کارِ علمی میں مصروف رکھ سکا۔

مجھے ایم - اے (اردو) کے ایک سو سے زیادہ تھیس دیکھنے / کرانے کا موقع ملا، پی ایچ ڈی کے آٹھ دس کاموں کی نگرانی / رہنمائی اور تکمیل کی خوشی پائی، اب بھی متعدد اسکالرز پی ایچ ڈی کی سطح پر میرے ساتھ کام میں مصروف ہیں، کچھ ابتدائی مرحلے میں ہیں اور کچھ حدِ آخر کے قریب۔

خدا کا شکر ہے کہ محکمہ تعلیم حکومت پنجاب نے بھی عزت افزائی میں کوئی کسر نہ چھوڑی، مجھے BS-21 میں لیے جانے والے ”پہلے پروفیسر“ کا غیر معمولی امتیاز حاصل ہوا، اس تمام عرصے میں مختلف انتظامی عہدوں کے لیے مجھ سے کہا جاتا رہا، سکریٹری ایجوکیشن تک کے منصب کی پیش کش ہوئی، اسے میں نے عزت افزائی جانا لیکن تدریس سے وابستہ رہنے کو ترجیح دی - نتیجتاً مجھے علمی کاموں میں یکسوئی نصیب رہی اور میں اپنے میدان کار میں کچھ کرسکا، میرے ایک مہربان دوست کا شعر ہے کہ:

”یہ آنے والا زمانہ بتائے گا تم کو!

مرا وجود زمیں پر خدا کا احساں تھا“

مجھے اپنے بارے میں اس طرح کا تو کوئی گمان ہرگز نہیں لیکن کسی قدر یقین سا ہے کہ اس نواح میں ”اچھا برا، کچھ اپنا اثر چھوڑ جاؤں گا“۔

جی سی کے زمانہ قیام میں آپ نے مجھے جو عزت اور محبت دی، اس کا شکریہ تو

ادا کرنا ممکن ہی نہیں بہرنوع آپ کے التفات کے لیے ممنون ہوں اور آپ کی
دعاؤں کا طالب رہوں گا''۔ (دست خط از سید معین الرحمٰن)

میں اسے خلاف موقع سمجھتا ہوں کہ اس مکتوب کے ذریعے مکتوب نگاری کی تحلیل نفسی کی جائے یا مکتوب کے مندرجات سے بحث کی جائے مگر اتنا ضرور ہے کہ وہ اپنی زندگی، اپنے کام اور اپنے دوستوں کے رویوں سے مطمئن اور خوش تھے، یہ ان کی اعلاظرفی تھی کہ انہوں نے اپنے تلخ، تکلیف دہ اور جان لیوا لمحات اور حادثات کا تذکرہ اس مکتوب میں نہیں کیا۔

۱۹۹۶ء میں، میں نے ان کی ادارت میں شائع ہونے والے گورنمنٹ کالج لاہور کے مجلے ''تحقیق نامہ'' پر تبصرہ کیا جو سہ ماہی ''انشا'' حیدرآباد سندھ میں شائع ہوا، میرے ایک دوست شاہ انجم بخاری نے انہیں اس کی اطلاع دی، ''غالب نامہ'' کی صورت میں الوقار پبلی کیشنز سے شائع ہونے پر میں نے انہیں خط لکھ کر چند نسخے دوستوں کے لیے قیمتاً طلب کیے تو وہ بہت خوش ہوئے، یوں خط کتابت کا سلسلہ شروع ہوا۔

ڈاکٹر نجم الاسلام (م: ۱۳؍فروری ۲۰۰۱ء) کی وفات حسرت آیات پر انہوں نے بعض اخبارات اور پاکستان اور بیرون پاکستان بعض حضرات کو اس سانحے کی اطلاع دی، روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور میں یہ خبر ۱۵؍فروری ۲۰۰۱ء کو شائع ہوئی جس میں اعتراف کیا گیا کہ ''ڈاکٹر نجم الاسلام کی وفات کی خبر گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبۂ اردو کے سربراہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے دی تو لاہور کے علمی اور ادبی حلقوں میں صف ماتم بچھ گئی''، مخدومی ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب کے نام ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کا تعزیتی مکتوب ''گوشۂ نجم الاسلام''، رسالہ سہ ماہی انشا حیدرآباد سندھ ۲۰۰۲ء کی زینت بنا، جب کہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب کا جوابی مکتوب بہ نام ڈاکٹر سید معین الرحمٰن اور ڈاکٹر مختار الدین احمد اور ڈاکٹر نذیر احمد کے نام ان کے مکتوب اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا جوابی مکتوب ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کے نام سہ ماہی انشا حیدرآباد سندھ کے ''ڈاکٹر نجم الاسلام نمبر'' (حصۂ اول) مارچ ۲۰۰۲ء میں شائع ہوئے۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب کے نام ان کا مکتوب محررہ ۱۳؍فروری ۲۰۰۱ء سے اقتباس دیکھیے:

''دل پر ایک قیامت گزر گئی۔ آپ کے فیض تربیت سے متمتع ہونے والوں
میں وہ ارشد اور ارفع ترین تھے، ہمارے عہد اور اپنے ہم عمروں میں حد درجہ محتاط
اور معتبر۔ بے حد صاحب نظر، انتھک اور بہت خاموش اور کارگزار''۔

کم لفظوں میں سلیقے سے پرتاثیر بات کہنے اور خاکہ کھینچنے کا یہ فن جہاں مبدء فیض کی فیاضیوں کا ایک کرشمہ اور غالب اور رشید احمد صدیقی سے تعلق خاطر کی ایک زندہ مثال ہے وہاں ان کے شوق، محنت اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا آئینہ دار بھی ہے، مکتوب کے اس اقتباس کو پڑھ کر رشید احمد صدیقی کے خاکے ''مولانا محمد علی'' کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، رشید احمد صدیقی کا ایک ایک لفظ ایک ایک فقرہ مولانا کی محبت سے سرشار ہے، دفاع کرتا ہوا، داد دیتا ہوا، سینہ سپر بھی اور سینہ کوب بھی، دل شاد بھی اور دل فگار بھی، ان میں آنے والوں کے لیے عبرت کا سامان تھا، مگر:

ع   بے کسی ہائے تمنا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق

وہ فقرے آج پھر ایک محمد علی، اس کے ماحول، اس کے دوستوں اور دشمنوں کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتے ہیں:

''محمد علی کا قلب حزیں تھا لیکن روح تابندہ و تپاں۔ محمد علی پر دولت و
شہرت کی بارش ہوئی، محمد علی نے ان دونوں کو سیلاب کی طرح بہا دیا، دونوں نے
مفارقت کی، بدنامی اور مفلسی سے بھی سابقہ پڑا لیکن یہ چیزیں جسم و جاں کی تھیں،
ان کی روح پاک تھی۔ طاہر۔ محمد علی کی ذہانت اور فطانت اب کہاں ملے گی،
وہ ایک شیر کی مانند تھے جس کو شیروں سے نہیں، لومڑی اور بھیڑیوں سے سابقہ
ہو، محمد علی کے باب میں بعض کہتے ہیں کہ وہ بڑے تھے لیکن ان کا کوئی کارنامہ
نہیں ہے، یہ تنگ ظرفوں کا خیال ہے، محمد علی میں کم زوریاں بھی تھیں لیکن ان کی
کم زوریاں ایک اچھے شعر کی کم زوریاں تھیں جن سے شعر کے لطف و بے ساختگی
میں کوئی فرق نہیں آتا، محمد علی کی آغوش میں رحمت تھی، مرحوم آج خود ہماری
آنکھوں سے خون بن کر ٹپک رہے ہیں''۔ (گنج ہائے گراں مایہ)

۲۷؍جولائی ۲۰۰۱ء کو ان کے ایک اور محبت نامے سے نظریں پرتسکین اور دل شاد کام ہوا۔

"عزیز گرامی رفیق احمد خاں صاحب، سلام وسپاس

ڈاکٹر نجم الاسلام مرحوم کے ایک خط اور ایک 'پس نوشت' تحریر کا عکس آپ کی نذر ہے، اس خط کو میں نے 'فورٹ ولیم کالج' سے متعلق سید وقار عظیم کی کتاب کے تازہ اڈیشن میں محفوظ کردیا ہے، کتاب آپ کے لیے الگ رجسٹرڈ پیکٹ سے روانہ کرچکا ہوں، اسی پیکٹ میں 'معاصر' کا نیا شمارہ بھی رکھا ہے، جس میں "نسخۂ خواجہ" کے بارے میں مضمون ہے، یہی مضمون آپ کی تحویل میں بھی ہے، "انشا" میں اگر آپ کوئی "مطبوعہ" تحریر شامل نہیں کرتے تو فبہا - اور اگر 'قند مکرر' کی روایت ہو تو سبحان اللہ! خیر طلب"۔ (دست خط: سید معین الرحمن)

یہ مضمون "دیوان غالب نسخۂ خواجہ" آغا امیر حسین، مدیر ماہنامہ "سپوتنک"، لاہور کے قلم سے نکلا اور مارچ ۲۰۰۱ء کے شمارے میں شائع ہوا، جب کہ سہ ماہی انشا حیدرآباد سندھ کے شمارہ: ۳۱ر جولائی تا ستمبر ۲۰۰۱ء میں شامل ہوا، انشا شمارہ: ۱۸ر جنوری تا جون ۱۹۹۸ء میں ڈاکٹر صاحب کا ایک مضمون "اعلا مدارج میں مطالعۂ غالب" کے عنوان سے شائع ہوچکا تھا، مرحوم نے "سپوتنک" کے تین شمارے میرے ذوق مطالعہ کی تسکین کے لیے مرحمت فرمائے، مارچ و مئی ۲۰۰۱ء یہ شمارہ ماہر غالبیات کالی داس گپتا رضا کی یاد میں "راضی بہ رضا" کے عنوان سے ڈاکٹر سید معین الرحمن نے مرتب کیا تھا، اس میں ان کے نام گپتا رضا کے پندرہ عدد مکمل اور پانچ عدد مکتوبات کے اقتباسات پیش کیے گئے ہیں اور گپتا رضا کی دو غیر مطبوعہ تالیفات پر ان کا مضمون شائع ہوا ہے، علاوہ ازیں گپتا رضا کے شعری مجموعے "احترام" پر تبصرہ بھی شامل اشاعت ہے، تیسرا شمارہ مئی ۲۰۰۲ء کا ہے جو آل احمد سرور پر خاص نمبر ہے، اسے "سرور ابدی" کے عنوان سے مرحوم نے مرتب کیا تھا، یہ شمارہ ۱۶۰ صفحات کو محیط ہے، "حرف چند...... بیاد سرور" کے عنوان سے ڈاکٹر صاحب نے آل احمد سرور سے متعلق اپنی یادوں کے مرقع نذر قارئین کیے ہیں۔

ڈاکٹر نجم الاسلام کی وفات کے فوراً بعد سہ ماہی انشا حیدرآباد سندھ کے تازہ شمارے میں "گوشۂ ڈاکٹر نجم الاسلام" شائع کیا گیا، اس کی وصولیابی کی رسید انہوں نے اس طرح دی:

"انشا" کے دو شماروں پر مبنی پیکٹ وصول پایا، دلی شکریہ، احباب کو بھی

پیش کردیا ہے، آپ کی سعی بڑی قابل قدر ہے۔

نجم الاسلام صاحب کا غم بڑا شدید ہے...... مکتوبات کی جمع آوری بڑا مفید کام ہوگا مزید خط بھیجوں گا تحقیقی کام کے ارادے پر مستحکم رہیے گا"۔ (لاہور، محررہ: ۲ر مئی ۲۰۰۱ء)

میں نے علمی و ادبی اور تحقیقی حلقوں میں خطوط لکھے کہ سہ ماہی انشا حیدرآباد کی جانب سے ڈاکٹر نجم الاسلام نمبر نکالا جائے گا، آپ حضرات اپنے قیمتی خیالات سے مرحوم کی زندگی اور خدمات پر روشنی ڈالیے، بحمد اللہ ہم کامیاب ہوئے، اسی دوران میں نے ایک مطبوعہ مکتوب کے ذریعے یہ اطلاع بھی دی کہ راقم مرحوم کے مکتوب جمع کررہا ہے، جن حضرات کی ان سے مراسلت رہی ہو وہ مکتوبات کی عکسی نقول ارسال فرمائیں تاکہ انہیں کتابی صورت میں شائع کیا جائے، ڈاکٹر سید معین الرحمن غالباً اپنی مصروفیت کی وجہ سے کوئی مضمون تو تحریر نہیں کرسکے تاہم میری دل جوئی اور دل آسائی کی غرض سے ڈاکٹر نجم الاسلام کے چار عدد مکتوب بہ ذریعہ ڈاک ارسال فرمائے، بے حد افسوس ہے کہ وہ میرے اس منصوبے کو عملی صورت میں نہ دیکھ سکے، دیکھتے تو کتنا دل بڑھاتے، کن کن لفظوں سے میرے کام کی قدر کرتے اور سراہتے۔

مضمون کے اختتام پر ڈاکٹر سید معین الرحمن کے نام ڈاکٹر نجم الاسلام کے دو مکتوبات سے اقتباس پیش کرتا ہوں:

"خوبصورت تحفہ، آپ کا مرتبہ "دیوان غالب" موصول ہوا، اس عمدہ تدوین اور پیش کش پر مبارک باد پیش کرتا ہوں، آپ کی تعارفی تحریر شوق اور دل چسپی سے پڑھی، "توضیحات وتعلیقات" سے بھی مستفید ہوا، کس خوبی اور اخلاص کے ساتھ آپ نے اپنے ان بزرگوں کو یاد کیا ہے جن سے آپ مستفیض ہوتے رہے ہیں، یہ آپ کی سلامت طبع پر دال ہے اور پھر غالب و غالبیات سے آپ کی گہری وابستگی ہے اور قلبی تعلق ہے، وہ بھی بہ خوبی ظاہر و باہر ہے"۔

(محررہ: ۹ر دسمبر ۱۹۹۸ء)

آج کی ڈاک سے دیوان غالب نسخۂ خواجہ کا ڈیلکس اڈیشن ملا،

تہ دل سے اس گراں قدر تحفے کا شکریہ ادا کرتا ہوں، الوقار پبلی کیشنز نے حسنِ طباعت کو درجۂ کمال پر پہنچا دیا ہے، اس دل کش نسخے کے آئینے میں آپ کے ذوقِ ترتیب و تدوین کا جمال پہلے سے بھی زیادہ نکھر کر سامنے آیا ہے، خدا نظرِ بد سے بچائے اور سلامت بہ کرامت رکھے"۔ (محررہ: ۴؍جنوری ۲۰۰۱ء)

ڈاکٹر سید معین الرحمن کے قلم سے نکلا ہوا ایک برجستہ فقرہ ملاحظہ فرمایئے:

"صحت خستہ، فرصت کم اور کام بہت نتیجہ معلوم"۔

('مالک رام کے غیر مرتب قلمی خط' از ڈاکٹر سید معین الرحمن، مشمولہ "الماس"، ۷، ۲۰۰۴ء)

درحقیقت یہ ایک چھوٹا سا فقرہ ان کی اخیر زندگی کی تصویر پیش کرتا ہے، اس میں انہوں نے کس طرح اپنی صحت کی خستگی، عدیم الفرصتی، کثرت کار اور انجام سے باخبر ہونے کو ظاہر کیا ہے، یہ زندگی کے دو قطبین ہیں جن میں صبح و شام سمٹ کر آ گئے ہیں، انجام سے آگاہ ہونے کے باوجود اپنی بھر قوت سے مصروف کار رہنا اور رفقا اور تلامذہ کو کار علمی میں مصروف رکھنا بجائے خود ایک بہت بڑا کام ہے اور کسی طرح بھی نظر انداز کیے جانے کے لائق نہیں بلکہ قابل تقلید ہے۔

اپنا سا شوق اوروں میں لائیں کہاں سے ہم   گھبرا گئے ہیں بے دلی ہم رہاں سے ہم

مشفق خواجہ کے اس دنیا سے اٹھ جانے کے بعد اردو دنیا کے لیے ڈاکٹر سید معین الرحمن کی وفات اس سال ۲۰۰۵ء کا دوسرا بڑا سانحہ ہے جو کسی طرح بھی قیامت سے کم نہیں کہ یہ دنیا اردو کے دو ایسے محسنوں سے خالی ہوگئی جو ایک عمر سے گل زارِ اردو کی آب یاری اور چمن بندی کی محنت اٹھانے میں ہمہ تن مصروف و مشغول تھے، جب تک جیے نگارِ اردو کے گیسو سنوارتے رہے اور نوع بہ نوع ستاروں سے اس کے فلکِ بے نظیر کو مزین کرتے رہے۔

" یہ آنے والا زمانہ بتائے گا تم کو!

مرا وجود زمیں پر خدا کا احساں تھا"

۞۞۞۞
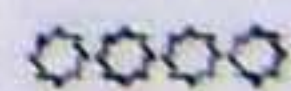
ادبیات

غزلیں

از:- ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی☆

(۱)

استادہ ام تنہا در ہجوم دشمنہا   داورا! چہ می خواہی دیگر از من تنہا؟

ہیچ جای در گیتی شادمانی دل نیست   دیدہ ایم صحرا و باغ و بام و برزنہا

ای ز حسنِ حق غافل، محوِ جلوۂ باطل!   کی رسی سرِ منزل، در قفای رہزنہا؟

طبعِ پاکبازِ ما، گشت موجب حرمان   با ہزار چہرہ چون ہست آئینہ تنہا

از زیان و سود آخر تا چہ عایدم گردد   لخت دل فروشم در کوچۂ برہمنہا

دردِ دل بہ کہ گویم؟ پیش تو چو یکسانست   نا شنیدن یکرہ، با ہزار گفتنہا

چون رئیس از گیتی مخلصی نمی خیزد

گوشہ ہای خاطر را پاک دار از ظنہا

(۲)

چہ در حرم سپری شد، چہ در صنم کدہ ہا

گذشت عمر دریغا کہ در الم کدہ ہا

بہ ہر دیار شکنجہ کشند حق طلبان

کجاست راہِ رہایی ازین ستم کدہ ہا؟

بہ مصرِ زیست نگہ کن بہ حالِ فرعونان

یکی بیا پہ تماشای این ہرم کدہ ہا

نگاہدار خدایا! حرم نشینان را

ز مکر بابلی کہ بافند در صنم کدہ ہا

دوای خاطر آشفتہ ام رئیس کسی

درون شہر فروشد، نہ در اجم کدہ ہا

☆ ہاؤس نمبر ۴/۱۱۸-۱اے، لوکو کالونی، (نئی آبادی) علی گڑھ، ۲۰۲۰۰۲۔

مطبوعات جدیدہ

حکیم سید ظل الرحمن حیات وخدمات: مرتبین ڈاکٹر سید حسن عباس، ڈاکٹر عبداللطیف، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات: ۶۱۶، قیمت: ۳۰۰روپے، پتہ: مرکز تحقیقات اردو فارسی، گوپال پور، باقر گنج، سیوان، بہار اور ابن سینا اکاڈمی، دودھ پور، علی گڑھ، یوپی۔

علم، ادب اور تدریس وتحقیق خصوصاً طب کے علم وفن کو حیات تازہ بخشنے والوں میں حکیم سید ظل الرحمن کا شمار اب صف اول کے مشاہیر میں ہوتا ہے، تجارہ کے ایک اعلا علمی خاندان سے تعلق اور بھوپال جیسے مردم خیز شہر سے نسبت، دار العلوم ندوۃ العلما سے اکتساب اور مسلم یونی ورسٹی سے تدریسی انتساب نے حکیم صاحب کی جامعیت کو کاملیت عطا کردی، ان کی شخصیت کی طرح ان کی علمی فتوحات واقعی قابل رشک ہیں، یہ اعتراف ضروری تھا اور زیر نظر کتاب نے قدردانی کی اس ضرورت کو بحسن وخوبی پورا کردیا ہے، قریب بارہ ابواب میں خاندان، طفولیت وشباب کے عہد اور یاران مہربان کے جذبہ محبت اور اعزہ واحباب کے اعتراف منزلت کے علاوہ حکیم صاحب کی تصانیف، مضامین اور ان کی نمایاں طبی وعلمی خدمات اور بر دم رواں زندگی کے تابندہ نقوش بھی بڑے سلیقے سے پیش کردئے گئے ہیں، مضامین کی طویل فہرست حکیم صاحب کی شخصیت کے اعجاز کا اظہار ہے کہ اس میں برصغیر کے ممتاز ترین اہل علم وفضل شامل ہیں اور ہر تحریر پڑھنے کے لائق ہے، ان کے خاندان کے متعلق تحریر محض بزرگوں کے ناموں کا شمار نہیں بلکہ اسلامی ہند کی تاریخ کا اہم باب ہے جس میں تیرہویں صدی عیسوی سے اب تک علما، صلحا، حکما وامرا کے آثار بڑے روشن اور تابناک نظر آتے ہیں احباب کے تاثرات داستان عہد گل کی شکل میں بہت دل چسپ ہیں، لیکن سب سے مفید حصہ تصنیفات کے تعارف کا ہے، آئینہ تاریخ طب، تقدمہ، دلی اور طب یونانی، تاریخ علم تشریح، علم الامراض، رسالہ جودیہ، مطب مرتعش جیسی کتابوں پر سیر حاصل تبصرے علم طب سے دل چسپی رکھنے والوں کے لئے بہت مفید ہیں،

تذکرہ خاندان عزیزی کی تالیف میں مولف کی تذکرہ نویسی کی داد مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے دی اور حیات کرم حسین میں ان کی سوانح نگاری کی تحسین یوں کی گئی کہ یہ کتاب دراصل ''ایک محور ہے جس کے گرد میوات کی تاریخ، جدوجہد آزادی، ملک کی تقسیم، سیاسی نشیب وفراز سب چیزیں گردش کرتی ہیں اور ان سب کے جلو میں طب یونانی کی نشاۃ ثانیہ اور اس سے متعلق حالات وکوائف بھی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں'' ایران نامہ گو سفر نامہ ہے لیکن اہل ذوق نے اس کا شکریہ اس لئے ادا کیا کہ اس کے ذریعہ ایران کی تاریخ اور ناموران ایران سے نئی شناسائی ہوئی اور اردو سفر ناموں میں ایک وقیع اضافہ ہوا، حکیم صاحب کا ایک اور کارنامہ ابن سینا اکاڈمی ہے، علم طب کے علاوہ اور علوم وفنون اور نادر ونایاب اشیا کا یہ خزینہ خود صاحب خزینہ کی نفاست اور ذوق کی ثروت کا آئینہ اور عہد جدید کے ایک ایسے علم پرور سالار جنگ کا خزانہ ہے جہاں ذوق کے علاوہ روح کی تسکین کا سامان ہے، حکیم صاحب کی بعض مطبوعات پر معارف کے تبصرے بھی اس میں شامل ہیں اور مدیر معارف مولانا ضیاء الدین اصلاحی کا یہ تاثر بھی کہ حکیم صاحب کے ''عظیم الشان کارنامے کی مثال اس زمانے میں نہیں مل سکتی''، بلند پایہ مضامین کے علاوہ اس کتاب کی نمایاں خوبی، اغلاط کتابت سے پاکی ہے، صرف ایک جگہ یعنی ص ۱۰۶ پر اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اسلام آباد کے ڈائرکٹر جنرل ظفر الحق انصاری کا ذکر ہے یہ غالباً ظفر اسحاق انصاری ہیں، مرتبین کتاب داد وتحسین کے لائق ہیں جنہوں نے ایک شریف ونفیس اور لائق تقلید شخصیت کا اس درجہ خوبصورت مرقع پیش کردیا۔

ارلی اردو ہسٹوریوگرافی EARLY URDU HISTORIOGRAPHY: از ڈاکٹر جاوید علی خاں، متوسط تقطیع عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۵۹۲، قیمت ۳۰۰ روپے، پتہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ۔

اردو میں تاریخ نویسی کی تاریخ ظاہر ہے قدیم نہیں انیسویں صدی کا نصف اول اس کا ابتدائی زمانہ ہے، قریب دو سو سال کی اس دلچسپ تاریخ کے ابتدائی آثار خود اردو میں زیادہ تر مستور الحال رہے فارسی تاریخ نویسی کے زوال اور انگریزوں کے تسلط کے ساتھ ہی مغربی تاریخ نگاری کے اثرات اور خود ہندوستان میں سیاسی اور ثقافتی تغیرات کی وجہ سے اردو کی اولین تاریخی کاوشوں کا

مطالعہ اور تجزیہ بجائے خود بہت اہم ہے انگریزی زبان میں یہ کاوش اور اہم اس لئے ہے کہ جدید ہندوستان کے مورخوں کا مرجع و ماخذ انگریزی تاریخ نگاروں کی مرتب کردہ تاریخیں ہیں جن کی استعماری ذہنیت کی کارفرمائی سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اردو کی یہ ابتدائی تاریخیں اس ذہنیت کی پردہ دری میں بھی معاون ہو سکتی ہے، زیر نظر کتاب کی تالیف میں یہی جذبہ کارفرما نظر آتا ہے کہ اردو تاریخ نویسی کے ابتدائی مراحل کے جائزے کے ساتھ مختلف سیاسی اور مذہبی تحریکات اور ان کے اثرات کا اسی دور کی کتابوں کی روشنی میں مطالعہ کیا جائے، لائق مصنف نے دیباچہ میں ایسی کئی اور کاوشوں کا ذکر بھی کیا ہے لیکن یہ محض جزوی تھیں، بالاستیعاب مطالعہ و تجزیہ کے لحاظ سے زیر نظر کتاب واقعی ایک بڑی اور سنجیدہ کوشش ہے، شروع کے چند ابواب میں اردو کے آغاز و ارتقا، تاریخ نویسی کے رجحانات، ہند فارسی تاریخ نگاری اور ہندوستان اولین تاریخ نگاری کا جائزہ ہے، انگریزی داں طبقے کے لیے ان مباحث کی افادیت ظاہر ہے، بعد میں اردو میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ، فورٹ سینٹ کالج مدراس، دہلی کالج کی خدمات کے ساتھ آزادانہ تاریخ نویسی اور اہم تاریخ نگاروں مثلاً کالے رائے، پنڈت دیبی پرشاد، منشی نول کشور، منشی غلام نبی، ایودھیا پرشاد منیری، نواب سکندر بیگم، منشی شیو پرشاد وغیرہ کی کتابوں کا مفصل جائزہ ہے اور بعد میں امیر علی، منشی سدھا سکھ لال، پنڈت بھولا ناتھ، مولوی کریم الدین، بلاقی داس اور محمد حیات خاں جیسے مورخین کی نگارشات کا ذکر ہے، سرسید اور علامہ شبلی کا ذکر تو ناگزیر ہے، لیکن اصل کارنامہ تو ان مورخین کا ذکر ہے جن کی نگارشات موضوع کے لحاظ سے بہت اہم لیکن جو قریب قریب گم نام رہے، خصوصاً علاقائی تاریخوں کے لحاظ سے ہندو مورخین کا ذکر اس کتاب کی امتیازی خوبی ہے یہ گوشہ تشنۂ تکمیل تھا اور لائق مصنف نے ان کی کتابوں کا جس جامعیت سے تجزیہ کیا ہے وہ ان کے حسن سلیقہ کی اچھی مثال ہے، جناب این آر فاروقی کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ اردو تاریخ نویسی میں اس کتاب کے ذریعہ ایک بڑا خلا پر ہوا، تاریخ ہند کے محققین کے لئے یہ کتاب یقیناً مفید ہے اور پر از معلومات بھی ہے، لائق مصنف شبلی ڈگری کالج کے شعبۂ تاریخ کے صدر اور دارالمصنفین کے اعزازی رفیق بھی ہیں، ان کے مضامین برصغیر کے انگریزی اور اردو رسائل و مجلات میں شائع ہوتے رہتے ہیں، خدا بخش لائبریری مستحق تحریک ہے کہ اس نے اس قابل قدر کتاب کی اشاعت کا اہتمام کیا۔

عربی زبان و ادب میں روہیل کھنڈ کا حصہ: از ڈاکٹر ابو سعد اصلاحی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات: ۳۱۲، قیمت: ۳۵۰ روپے، پتہ: رام پور رضا لائبریری، قلعہ رام پور، رام پور یوپی۔

عربی زبان و ادب کی ترویج و ترقی میں ہندوستان کے علما و فضلا کی داستان طویل بھی ہے اور پرثروت بھی، مجموعی لحاظ سے اس موضوع پر معلومات اور تحریروں کی کمی نہیں، عربی زبان و ادب کی جو بھی عالمی تاریخ ہوگی اس کے حصہ عجم میں شاید ہندوستان کا ذکر سب سے نمایاں ہوگا، لیکن ہندوستان کے بعض علاقوں اور خطوں نے اس سلسلے میں جو خدمات انجام دیں، جدا شکل میں ان کا جائزہ کم لیا گیا، اسی احساس کے پیش نظر اس کتاب کے لائق مصنف نے موجودہ اترپردیش کے شمال مغرب کے اضلاع شاہ جہاں پور، بریلی، بدایوں، پیلی بھیت، مراد آباد، بجنور اور رام پور پر مشتمل علاقے کا انتخاب کیا، یہ تمام اضلاع روہیل کھنڈ کی ریاست کا حصہ تھے اور آج بھی یہ نام غیر معروف نہیں، رام پور دارالسرور نے اس نام کو دوام بخشا، کتاب میں اس خطہ کی مختصر تاریخ بھی دی گئی اور پھر نواب فیض اللہ خاں سے نواب رضا علی خاں تک نوابین رام پور کا ذکر بھی کیا گیا ہے، بعد کے ابواب میں علوم نقلیہ و عقلیہ کی تقسیم اور ان تمام علوم میں روہیل کھنڈ کے اہل علم و قلم کا ذکر تفصیل سے ہے، مطالعہ و تحقیق اور دیدہ ریزی کے نتیجے میں یہ حقیقت سامنے آئی کہ روہیل کھنڈ کے دو سو سالہ دور میں عربی میں سو سے زیادہ علما نے تین سو سے زیادہ ایسی کتابیں لکھیں جن کی قدر و قیمت آج عالم اسلام میں مسلم ہے، خصوصاً علوم عقلیہ میں رام پور اور وہاں کے مدرسہ عالیہ کو جو تفوق حاصل ہوا اس کی مثال ہندوستان میں کہیں اور شاید ہی مل سکے، اس کے علاوہ مولانا رفیع مراد آبادی کی الافادات العزیزیہ، مولوی سلام اللہ کی کمالین حاشیہ جلالین، قطب الدین امروہوی کی مرآۃ القرآن، مولوی سلام اللہ کی محلی شرح موطا، محمد حسن سنبھلی کی مسند الامام الاعظم ابی حنیفہؒ وغیرہ اس علاقے کی عظمت کی شاہد عدل ہیں، تصنیفات و تالیفات کے علاوہ یہ پورا خطہ عربی مدارس سے معمور رہا، روہیل کھنڈ کے حکم رانوں نے بھی علم نوازی اور علم پروری کی اعلا مثالیں قائم کیں، یہ تمام داستان بڑی دل چسپ ہے اور جب علم الحساب میں العجاب، رسالہ فی الحساب اور القسطاس جیسی کتابوں کے متعلق یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لکھنے والے منولال فلسفی اور ان کے صاحب زادے کندن لال اشکی تھے تو حیرت کا احساس ہوتا ہے، لائق مصنف نے

ان ہندو مصنفوں کی عربی تحریر کے نمونے بھی پیش کیے ہیں، یہ کتابیں رضا لائبریری کے نادر نسخوں میں شمار کی جاتی ہیں اس کتاب کے ذریعہ ان کا اور ان جیسی اور بیش بہا کتابوں اور مخطوطات کا علم ممکن ہوا، اس قابل قدر کتاب کے لیے مصنف کے ساتھ رضا لائبریری شکریے کے لائق ہے۔

تاریخ اولیائے تمل ناڈو: از ڈاکٹر جاویدہ حبیب، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات: ۱۵۴، قیمت: ۴۰۰/روپے، پتہ: ۲۶-امیر النسا بیگم اسٹریٹ، چنئی، تامل ناڈو اور مکتبہ جامعہ وغیرہ۔

جنوبی ہند میں تامل ناڈو جیسے غیر اردو خطے کا جدید اردو منظر نامہ جناب علیم صبا نویدی اور ان کی لائق دختر محترمہ جاویدہ حبیب کے نام اور کام سے روشن ہے، اب تک اس خطے کی علمی، ادبی اور مذہبی تاریخ پر ان کے ذریعے بیسیوں مفید کتابیں شائع ہو چکی ہیں، زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلے میں شامل ہے جس میں حروف تہجی کے اعتبار سے ایک سو اسی اہل دل بزرگوں کا تذکرہ آگیا ہے، علمی و مذہبی خدمات کے ساتھ کشف و کرامات کی روایتیں بھی ہیں، احوال کو پانے کی حتی المقدور کوشش کی گئی ہے، یقیناً یہ مستحسن کوشش ہے، لیکن کتاب کی قیمت زیادہ ہے۔

مظفر نامہ (منظوم احادیث کا ایک قدیم کتابچہ): از ڈاکٹر انور حسین خاں، صفحات: ۲۴، قیمت: ۲۰/روپے، پتہ: دانش محل بک ڈپو، امین آباد، لکھنؤ اور اخلاق حسین خاں، غیورہ، وایا موئی، ضلع بارہ بنکی، یوپی۔

ایک فارسی شاعر رابط کی طویل فارسی نظم کا یہ منظوم ترجمہ قریب ایک صدی کی یادگار ہے، بارہ بنکی کی ایک دور افتادہ بستی کے مظفر خاں اور مرتضی خاں کا یہ ترجمہ، لائق مرتب کے موروثی کتب خانے کی زینت تھا، بزرگوں کی اس امانت کو انہوں نے ایک جامع تعارف کے ساتھ شائع کر دیا، اس سے پہلے بھی وہ اپنے خطے کے معروف و غیر معروف بزرگوں کے حالات اور کتابوں کو شائع کر کے گذشتگان کے نام نیک کو زندہ کرنے اور رکھنے کی سعی مشکور کر چکے ہیں، اس وقت کی زبان اور شرفا کی بستیوں کے ماحول کا اندازہ بھی اس مختصر رسالے سے بخوبی ہو جاتا ہے، پروفیسر وارث کرمانی کے پیش لفظ میں یہ توقع بجا ہے کہ اہل اردو اس کی انشاء اللہ پذیرائی کریں گے۔

ع۔ص